Rs.5/-
بارگاہِ سلطان المشائخ حضرت خواجہ سید نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کا
ماہنامہ
مُنادی
نئی دہلی

منادیٔ بیداریٔ دل الایمان

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ سے
ایمان اور امن کی ندا دینے والا
اور اُن کے جانشین
امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

ماہنامہ منادی نئی دہلی

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے یہ ۸۳ ویں جلد (اپریل ۲۰۰۹ء) کا چوتھا شمارہ ہے

مدیر
خواجہ حسن ثانی نظامی

مدیران
خواجہ سید نوید پاشا نظامی
خواجہ سید محمد نظامی

درگاہ شریف اور منادی کے بارے میں خط و کتابت کرنے اور قیمت جمع کرانے کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاء
نئی دہلی ۱۳-۱۱

سالانہ قیمت
ہندوستان میں
پچاس روپے
غیر ممالک سے
دس ڈالر
فی پرچہ
پانچ روپے

فہرست

☆☆☆

پرنٹر پبلشر خواجہ حسن ثانی نظامی نے، ایم آر پرنٹرس، گلی گڑھیا کوچہ چیلان، دہلی ۲ میں چھپوا کر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نئی دہلی ۱۳ سے شائع کیا

مصور فطرت خواجہ حسن نظامیؒ (۱۸۷۸-۱۹۵۵) اور تذکرہ ۱۸۵۷ء

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی

آپ کی پیدائش ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بیس سال بعد ہوئی۔ پھر کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ میں وجود میں آیا اور آزادی کی تحریک شروع ہوئی، جس کے نتیجے میں آزادی ملی، ملک تقسیم ہوا، جس کے نتیجے میں قتل و غارت ہوا۔ صوفیا نے ۱۱۹۲ کی ترائن کی جنگ کی تلخیوں کو ختم کر کے تیرھویں صدی عیسوی سے لوگوں میں یکجہتی، میل ومحبت پیدا کی تھی سب ختم ہو کر رہ گئی، آزادی سے پہلے بھی آزادی کے بعد بھی آج تک ہندوستان فرقہ وارانہ فسادات کا شکار رہتا ہے۔ ان تمام تجربات نے خواجہ صاحب کی شخصیت میں ایک نکھار پیدا کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستانیوں کے مقابلے میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی تب انھوں نے ہندوستانیوں پر سخت ظلم ڈھائے، لیکن ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کو انگریزوں کی بربریت کا زیادہ سامنا کرنا پڑا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۸۵۷ کے بعد انگریزوں نے کسی مندر کو نقصان نہیں پہنچایا، جبکہ صرف دہلی میں اکبر آبادی بیگم، زوجہ شاہجہاں بادشاہ کی تعمیر کردہ مسجد جو جامع مسجد کے سامنے تھی، اورنگ آبادی بیگم زوجہ اورنگزیب کی تعمیر کردہ مسجد جواب جہاں لال قلعہ کے قریب ریلوے لائن ہے وہاں تھی۔ مولوی محمد باقر ایڈیٹر دہلی اردو اخبار کا تعمیر کردہ امام باڑہ جو محلہ بلاقی بیگم میں تھا مسمار کر دیا گیا، جامع مسجد دہلی کو اصطبل بنا دیا اور ۱۸۶۲ میں اس میں نماز شروع ہو گی۔ انھیں تمام حالات کا اثر تھا کہ سر سید احمد خاں نے ۱۸۵۸ میں اسباب بغاوت ہند اور ۱۸۵۹ میں سرکشی ضلع بجنور لکھی۔ خواجہ حسن نظامی کا حساس دل بھی ۱۸۵۷ء کے واقعات سن کے تڑپ گیا ہوگا اور اسی کے نتیجے میں ان کے قلم سے

محاصرہ غدر دہلی کے خطوط، بیگمات کے آنسو، بہادر شاہ کا مقدمہ، دہلی کی جاں کنی وغیرہ نکلیں۔ کیسے حساس لوگ تھے کہ سرسید نے ۱۸۵۷ کے بعد دو کتابیں لکھیں اور پھر خواجہ حسن نظامیؒ نے لکھیں اور آج جب ملک ۱۸۵۷ کی ۱۵۰ ویں سالگرہ منا رہا ہے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۸۵۷ کی یاد نہ مناتے ہوئے بانی ہی کی کتابوں کو بنیاد بناتے ہوئے ایک نیشنل سیمینار کر دیا ہوتا۔ میں خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے اس سیمینار کے موقع پر ۱۸۵۷ سے متعلق خواجہ حسن نظامی کی تحریروں سے متعلق ایک مقالہ لکھنے کے لیے کہا اور اسی کے نتیجے میں آپ کے سامنے یہ مقالہ پیش کر رہا ہوں۔

۱۸۵۷ء سے متعلق دستاویزات کی تعداد تقریبا ۸۰ ہزار نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی، اتر پردیش آرکائیوز لکھنؤ والہ آباد، بہار اسٹیٹ آرکائیوز، پٹنہ، مدھیہ پردیش اسٹیٹ آرکائیوز، بھوپال، راجستھان اسٹیٹ آرکائیوز، بیکانیر، مختلف اضلاع کے محافظ خانوں اور دوسری لائبریریوں اور لوگوں کے ذاتی کلکشن میں موجود ہیں۔ یہ دستاویزات فارسی اور اردو زبان میں ہیں۔ لیکن ڈیڑھ سوویں سالگرہ تک پہنچ کر بھی ہم ابھی تک ان کا مطالعہ کرنا تو دور کی بات رہی، نہ تو ان کی لسٹنگ اور نہ ہی کلینڈرنگ کر پائے۔ میں نے ۱۵۰ دستاویزات کا مطالعہ کر کے ایک کتاب 1857 Revisited شائع کی ہے۔ انھیں میں ایک دستاویز درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے متعلق شائع کی ہے۔ جو اس کے ساکنین نے لکھ کر بھیجی۔

مانایان کہ ساکنان رئیسان درگاہ حضرت نظام الدین

اولیاء، اہل اسلام واہل ہنود کٹڑہ ارادت مند خاں ایم۔ جس روز سے کہ یہ عملہ تھانہ بدر پور عرب سرائے میں متعین ہوا ہے اس طرح آسائش اور امن رہا ہے کہ ہیچ گونہ تکلیف کے اعلیٰ ادا متاد کو ہی پہنچتے۔ بلکہ قبل از تھانہ کی تمام شب بیداری اور ہوشیاری بخوف قوم گوجر اور رہ زنان رہتے تھے اور اب از وقت تقرری تھانہ ہر کوئی ہر سہ بستی یعنی درگاہ حضرت نظام الدین اور عرب سرائے اور کٹڑہ میں بہ آرام اپنے اپنے گھر میں سوتے ہیں اور بوجہ مواصفات میں لوٹ مار موقوف ہوگئی ہے کہ تھانہ دار صاحب نے اپنے علاقے کے گوجروں کو بلوا کر مچلکہ لیے اور ذمہ داری کرائی اور ہم لوگوں نے ابتدائے تقرری تھانہ سے اب تک کسی طرح کی شکایت عملہ تھانہ کی کسی رعایا کی زبان سے نہیں سنی اور اگر کوئی کری تو یہی کہی اس واسطہ یہ چند کلمہ بطریق محضر کے لکھدیے ہیں کہ سند ہوویں اور عندالحاجت بکار آویں تحریر تاریخ ۳ رشوال ۲۱ (مطابق ۲۷ مئی ۱۸۵۷ء)۔

العبد: میر خورشید علی ساکن درگاہ۔ العبد، سنگھ رام نمبردار کٹڑہ ارادت مند خاں۔

العبد۔ ٹیکارام ساکن کٹڑہ ارادت مند خاں۔ العبد۔ ٹھاکر جی زمیندار کٹڑہ ارادت مند خاں۔

العبد۔ سید قمر الدین، ساکن درگاہ، مہر۔ العبد سید شرف الدین، ساکن درگاہ، مہر۔

سید ظہور الحسن، ساکن درگاہ، مہر۔ سید بدیع الدین، ساکن درگاہ، مہر۔

اس درخواست سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی کے حالات خراب ہوئے اور لوگوں نے لوٹ مار شروع کردی، اور ساکنان درگاہ نظام الدین اولیاء، کٹڑہ ارادت مند خاں اور عرب سرائے پریشان ہوگئے اور حکومت نے تھانہ عرب سرائے میں قائم کیا، جس کی وجہ سے لوگ امن سے رہے، لیکن آج بستی نظام الدین اور عرب سرائے کا نام تو سننے میں آتا ہے لیکن کٹڑہ ارادت مند خاں کا نام اب سننے میں نہیں آتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان بستیوں کے ناموں کا احیاء کیا جائے تاکہ تاریخ سے رشتہ قائم رہے اور تاریخ کا طالب علم اور دوسرے حضرات ان جگہوں کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرسکیں۔

خواجہ حسن نظامی نے غدر پر کافی لکھا جو خود ایک ریسرچ کا موضوع ہوسکتا ہے۔ لیکن پریشانی یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کو ہندوستان کی جدید تاریخ کا دور مانا جاتا ہے اور اس دور پر کام کررہے مؤرخین اور ریسرچ اسکالرس فارسی اور اردو زبان سے واقف نہیں۔ بہت کم تعداد ایسی ہے جو اردو زبان سے واقف ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ سے متعلق ان دستاویزات اور کتابوں کا کہ جو فارسی اور اردو زبان میں ہیں خاطر خواہ مطالعہ نہیں کیا گیا۔ نتیجہ کے طور پر ان کی تحقیق انگریزی زبان میں ماخذوں تک محدود ہے۔ اور ہم آج تک چاہے وہ اسکول کالجوں اور یونیورسٹی کے طلبا ہوں، ۱۸۵۷ پر جو کچھ انگریزی زبان میں ہے، اسی کی بنیاد پر پڑھا رہے ہیں۔ اور اس بات کو ۱۵۰ سال کا عرصہ گذر گیا اور جتنی تیزی سے یہ وقت گذر رہا ہے اتنی ہی تیزی سے ان مؤرخین کی تعداد کم تر ہوتی جارہی ہے جو فارسی اور اردو زبان سے واقف ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے ان مجموعوں میں دو مجموعوں کی بڑی اہمیت ہے، محاصرہ غدر دہلی کے خطوط اور انگریزوں کی بپتا۔

آپ لکھتے ہیں کہ ''اس کتاب کو انگریزوں کے لکھے ہوئے حالات سے ترجمہ کرایا گیا ہے یعنی جتنے قصے اس کتاب میں ہیں، وہ سب انگریزی زبان میں تھے اور بعض حصے خان بہادر شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صاحب مرحوم کی اردو ''تاریخ ہند'' سے میں نے چھانٹے ہیں اور بعض حصے ذاتی تحقیقات سے گھر بہ گھر پھر کر اور ایک ایک آدمی سے پوچھ کر خود میں نے قلم بند کیے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کا حجرہ اور مکان عہد وسطی کے مشہور مؤرخ ضیاء

الدین برنی، صاحب تاریخ فیروز شاہی کی قبر سے نزدیک ہے۔ برنی نے بھی غیاث الدین بلبن کے عہد کے واقعات لوگوں سے دریافت کر کے لکھے۔ برنی ہندوستان میں تاریخ میں صحت مند روایات کا بانی ہے۔ سرسید نے اردو میں صحت مند تاریخ نگاری کی روایت قائم کی۔ خواجہ حسن نظامیؒ کے اس جملہ ''بعض حصے ذاتی تحقیقات سے گھر بہ گھر پھر کر اور ایک ایک آدمی سے پوچھ کر خود میں نے قلم بند کیے ہیں۔'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کے لکھنے میں بڑی محنت کی، آج جس کو ہم Oral History کہہ رہے ہیں، برنی نے چودھویں صدی عیسوی اور خواجہ حسن نظامیؒ نے ۱۹ویں صدی عیسوی میں اپنی تحقیق کاوشوں میں استعمال کیا ہے۔ اور یہ ان کے مورخ ہونے کی دلیل ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ خواجہ حسن نظامیؒ کے کتنے وسائل تھے۔ خواجہ حسن ثانی ہی بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے ان خطوط اور دستاویزات کا انگریزی سے اردو ترجمہ کس طرح کرایا اس لیے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی، اتر پردیش اسٹیٹ آرکائیوز، لکھنؤ اور الہ آباد کہ جہاں ۱۸۵۷ سے متعلق دستاویزات کا نہایت اہم ذخیرہ موجود ہے، آج تک ۱۵۰ سال گذرنے کے بعد بھی اس کا کلینڈر تیار نہ کر پائے۔ ترجمہ کرنا تو بڑی بات ہے۔ اور نہ ہی ۱۹۷۳ سے قائم انڈین کاؤنسل آف ہسٹوریکل ریسرچ بھی اس میدان میں کوئی کارنامہ انجام دے پائی۔ اور خواجہ حسن نظامیؒ نے تن تنہا ایک اہم کام انجام دے دیا۔

آپ لکھتے ہیں کہ ''میں نے اس تاریخی کتاب کے پہلے حصے ''بیگمار کے آنسو'' نامی کتاب میں ہندوستانی عورتوں اور مردوں کی مصیبت کے حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں اور پڑھنے والے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ۱۸۵۷ میں باغیوں نے بھی بہت ظلم کیے تھے مگر انگریزوں نے بھی کچھ کم ظلم نہیں کیے تھے، انسان کا وحشیانہ پن دونوں میں یکساں نظر آتا ہے۔ البتہ یہ بات بھی ان قصوں سے ظاہر ہوتی ہے کہ ہر انگریز عورت مرد کو ہر مقام پر رحم دل ہندوستانی بہت زیادہ میسر آتے رہے، خاص کر مسلمان فقیر اور ہندو سادھو ہر جگہ رحم دل ثابت ہوئے۔ لیکن جب انگریزوں کو غلبہ حاصل ہوا تو ان کی قوم میں ایسے بہت کم آدمی تھے جنھوں نے بے گناہوں پر ترس کھایا ہو۔'' خواجہ حسن نظامیؒ اس ظلم کا بھی ذکر کر رہے ہیں جو ہندوستانی سپاہیوں نے عیسائی عورتوں اور بچوں پر کیے۔ یہی بات ۱۸۵۷ سے متعلق دستاویزات غدر میں بھی بعض علماء نے کہی کہ عورتوں اور بچوں کے قتل کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ یہی بات مولوی محمد باقر ایڈیٹر دہلی اردو اخبار نے بھی کہی ہے۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی اور اس کے اطراف پر جو مظالم انگریزوں نے کیے ان کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی، خواجہ صاحب لکھتے ہیں ''میں نے ''بیگمات کے آنسو'' کے بعد ہی یہ کتاب اس لیے لکھنے ضروری سمجھی تھی کہ ہندوستانیوں کے ظلم و ستم بھی سب کے علم میں آ جائیں اور ہندوستانیوں پر یہ الزام نہ لگایا جائے کہ وہ اپنی ہی قوم کی مظلومیت پیش کرتے ہیں لہٰذا میں بحیثیت ایک ہندوستانی ہونے کے اور بلحاظ ایک مسلمان ہونے کے فخر کر سکتا ہوں کہ میں نے انقلاب دہلی ۱۸۵۷ کی تاریخ لکھنے میں انصاف اور نیک نیتی سے کام لیا ہے۔ یہ ان کے منصف مزاج مؤرخ ہونے کی دلیل ہے۔ ہندوستان میں فارسی تاریخ نگاری کی بنیاد انھیں اصولوں پر پڑی تھی اور ضیاء الدین برنی صاحب تاریخ فیروز شاہی جو چودھویں صدی عیسوی کے مورخ ہیں، انھوں نے ایک اچھے مورخ کی یہی پہچان بتائی ہے کہ وہ حقائق کے بیان کرنے میں انصاف سے کام لے۔ برنی کی قبر بھی درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء ہی کے احاطہ میں ہے۔

آپ لکھتے ہیں ''دراصل انگریز مردوں اور عورتوں نے اپنی مصیبتوں کا جو حال لکھا ہے وہ انگلستان میں رہنے والوں اور

یورپ کے رہنے والوں کو اس جاں فشانی سے آگاہ کرنے کی غرض سے لکھا ہے جو ان کو ہندوستان حاصل کرنے کے لیے پیش آئی۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کی ہر قوم جب کسی دوسری قوم پر غلبہ حاصل کرتی ہے تو ایسی ہی سفاک اور بے رحم بن جاتی ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی امیہ کے بادشاہ امیر معاویہ کے بیٹے یزید نے رسول اللہ کی اولاد پر اس سے زیادہ بے رحمانہ ظلم کیے تھے، حالانکہ دونوں ایک خاندان اور ایک مذہب اور ایک ملک کے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کا انداز ضیاء الدین برنی سے مطابقت رکھتا ہے۔ اسی طرح کا تجزیہ بھی برنی نے چودھویں صدی عیسوی میں پیش کیا تھا۔ خواجہ حسن نظامی فارسی تاریخ نگاری کے فن سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔

آپ لکھتے ہیں ''میں تسلیم کرتا ہوں کہ خود غرض ہندوستانی مخبروں نے اپنے ملک کے بہت سے بے گناہ لوگوں پر جھوٹی مخبری کر کے انگریزوں سے ظلم کرائے لیکن انگریز حکومت انصاف پسند اور مہذب حکومت تھی، اس کا فرض تھا کہ بعد میں جب راجہ بلبھ گڑھ کے ان احسانات کو اس کا علم ہوا تھا تو وہ راجہ بلب گڑھ کی حکومت دے دیتی اور بلب گڑھ کو ضبط کر کے گڑگانوہ کے ضلع میں شریک نہ کیا جاتا۔'' میں نے ''بہادر شاہ کے مقدمہ'' میں جو اس تاریخ کا چوتھا حصہ ہے راجہ بلبھ گرد اور نواب جھجر کے مقدمات کا حال بھی لکھا ہے۔ جن کی روداد سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان دونوں کے جرائم ایسی سخت سزا کے مستحق تھے'' خواجہ حسن نظامی اپنے اس تجزیہ میں حق بجانب نظر آتے ہیں کہ ۱۸۵۷ سے متعلق جو دستاویزات نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی میں محفوظ ہیں کہ دہلی میں یہ بات لوگوں کو معلوم تھی کہ راجہ ناہر سنگھ، راجہ بلبھ گڑھ نے کچھ انگریزوں کو پناہ دی تھی لیکن جب اس بات کا علم راجہ ناہر سنگھ کو ہوا تو انھوں نے اس کی صفائی میں خطوط بہادر شاہ کو لکھے۔ میوٹنی پیپرس کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ ان کی روشنی میں انگریزوں نے یہ فیصلے کیے۔ لیکن آزادی کے بعد رجحان بدلا اور جن لوگوں نے اپنی جان کی قربانی دی ان کی یاد بنائی جاتی ہے۔ راجہ ناہر سنگھ کو بھی ۹ رجنوری ۱۸۵۸ء میں چاندنی چوک میں کوتوالی کے سامنے پھانسی دے دی گئی۔ سورج مل انسٹی ٹیوٹ، دہلی ۹ر جنوری ۲۰۰۸ کو ان کی قربانی کی یاد منانے جارہا ہے۔ نواب عبدالرحمٰن خان بہادر شاہ کے ساتھ تھے لیکن کوئی مدد نہیں کی ایسے دستاویزات میوٹنی پیپرس میں موجود ہیں۔ پہلے میٹکاف کو پناہ دی پھر لوگوں کے دباؤ میں میٹکاف کو جھجر سے نکال دیا۔ یہ میٹکاف زندہ رہا۔ اور نواب عبدالرحمٰن خاں، نواب جھجر کو بھی چاندنی چوک کی اسی کوتوالی میں پھانسی دے دی۔ انگریزوں نے ان لوگوں کو معاف نہیں کیا جو پوری طرح ان کے ساتھ نہ تھے اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ نہ صرف ان دونوں کو پھانسی دی بلکہ بلبھ گڑھ اور جھجر کے قلعوں کو بھی مسمار کر دیا۔ بیگم حضرت محل انگریزوں کو سمجھ پائی تھیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ انگریزوں کی تو یہ عادت ہے کہ وہ کسی کا جرم معاف نہیں کرتے۔ راجہ ناہر سنگھ، راجہ بلبھ گڑھ کی یاد تو سورج مل انسٹی ٹیوٹ ہر سال مناتا ہے لیکن نواب عبدالرحمٰن خان، نواب جھجر کی کوئی یاد نہیں منائی جاتی۔ لیکن کچھ سال قبل چاندنی چوک کی اس کوتوالی کو جو ۱۸۵۷ کی اہم یادگاروں میں سے تھی؛ جہاں ہندوستانیوں کی کثیر تعداد کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا، دہلی گورنمنٹ نے گرودوارہ سیس گنج کو دے دیا اور آج جب ملک ۱۸۵۷ کی ۱۵۰ویں سالگرہ منا رہا ہے تو وہ کوتوالی دہلی کے نقشے پر موجود نہیں ہے۔

مؤرخین بھی اپنے رجحانات رکھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامیؒ ذکاء اللہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب انگریزی سرکار کے ثابت قدم وفادار تھے انھوں نے بھی اپنی ''تاریخ ہند'' میں جو حالات انقلاب ۱۸۵۷ کے لکھے ہیں ان کو میں نے ''دہلی کی جانکنی'' کتاب میں درج کیا

ہے۔ عہد وسطیٰ میں تو ہندوستان کی تاریخ پر کافی کام ہوا اور فارسی تاریخ نگاری کی ایک صحت مند روایت مسلمانوں نے ہندوستان میں ڈالی۔ لیکن اٹھارویں صدی میں تاریخ ہند، مدارس اور پاٹھ شالوں کے نصاب میں شامل نہیں تھی لہٰذا تاریخ ہندوستان پر کوئی کتاب اس دور میں نہیں لکھی گئی۔ تاریخ ہندوستان کے مطالعہ کا باقاعدہ کام انگریزوں نے شروع کی۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن نے History of India as told by its own historians لکھی۔ اس کے بعد تاریخ کے فارسی ماخذ کو مرتب کر کے شائع کیا پھر ان کے تراجم بلوک مین اور بیورج نے بابر نامہ، اکبر نامہ اور آئین اکبری کے کیے۔ اس کے بعد ایلفنسٹن اور ولیم نے ہندوستان کی تاریخ لکھی۔ اس کے جواب میں شبلی نعمانی، ذکاء اللہ وغیرہ نے تاریخ ہند سے متعلق لکھنا شروع کیا۔ لیکن اردو زبان تاریخ کی صحت مند روایت کو نہ اپنا سکی نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو ذکاء اللہ کی تاریخ ہند اس وقت کے نصاب کا حصہ بن سکی اور نہ ہی آج کسی نصاب کا حصہ بن سکی۔ جبکہ سرسید کی آثار الصنادید آج بھی نصاب کا حصہ ہے۔ ضیاء الدین برنی نے یہ بات چودھویں صدی عیسوی میں کہہ دی تھی کہ جو کتاب تاریخ کے معیار پر پوری نہیں اترتی اس کو لوگ نہیں خریدتے اور جب اس کے نسخے دکان پر پڑے پڑے پرانے ہو جاتے ہیں تو ان کتابوں کے کاغذ دھو کر اس پر دوسری کتاب لکھ دی جاتی ہے۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بعض تاریخ کی کتابیں ۸۰ فی صد ڈسکاؤنٹ پر فروخت ہوتی ہیں۔ اگر ذکاء اللہ نے اپنی تاریخ میں انگریزوں کے ساتھ وفاداری نباہی تو ظاہر ہے کہ ان کی تاریخ، تاریخ کے اس معیار پر نہ اتر سکی۔ نتیجتاً اس کے پڑھنے والے بھی نظر نہیں آتے۔

خواجہ حسن نظامی ”بہادر شاہ کا مقدمہ“ میں لکھتے ہیں ”اس کتاب میں جس قدر شہادتیں بہادر شاہ بادشاہ کے خلاف جمع کی گئی ہیں اور جن پر سرکاری وکیل نے ایک طولانی تقریر ججوں کے سامنے کی تھی، ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ بہادر شاہ اور اسلام و مسلمان اس غدر اور فتنہ و فساد کے بانی مبانی تھے۔ عجیب سانحہ ہے کہ ۱۸۵۷ کے واقعات پر جب عدالت میں بحث ہوئی تو عدالت نے یہ طے کیا کہ انگریزوں کے خلاف اس تحریر کے ذمہ دار بہادر شاہ، اسلام اور مسلمان تھے، لیکن ہم نے جو کام ۱۸۵۷ پر کیا، جن میں پروفیسر بپن چندرا وغیرہ بھی شامل ہیں، انھیں کی تصنیف کردہ کتاب NCERT کے نصاب میں شامل تھی اور تمام اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس میں ایک بات ۱۸۵۷ پر بھی ہے۔ اس میں بہادر شاہ تو ہیں لیکن اسلام اور مسلمان موجود نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب مورخین ہی نے نہیں لکھا تو سرکار کی توجہ کیسے ہوتی۔ ہماری سرکار نے ایک روڈ کا نام بہادر شاہ مارگ رکھ دیا۔ ان کے علاوہ ۱۸۵۷ کے کسی مسلم مجاہد کا نام موجود نہیں، حد یہ ہے کہ جو سرکار نے اس سال ایک لسٹ ۱۸۵۷ کے مجاہدین کی تیار کی اس میں بھی مسلم مجاہدین کی تعداد بہت کم ہے۔ دہلی کا پہلا اردو اخبار ۱۸۳۶ سے دہلی اردو اخبار کے نام سے مولوی محمد باقر نے شروع کیا۔ دہلی اردو اخبار نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ سے ۱۳ر ستمبر ۱۸۵۷ تک انگریزوں کے خلاف جہاد بالقلم کیا۔ جس کے نتیجے میں مولوی محمد باقر کو ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ کو گرفتار کیا گیا اور انھیں دہلی گیٹ کے قریب ایک جیل میں ۱۵ر ستمبر ۱۸۵۷ کو پھانسی دے دی گئی۔ لیکن جب آزاد ہندوستان میں دہلی گورنمنٹ نے مولانا آزاد میڈیکل کالج تعمیر کیا تو اس جیل کو جہاں بہت سے مجاہدین آزادی کو ۱۸۵۷ میں سولی پر چڑھا دیا گیا تھا مسمار کر دیا، بہت خوب، نام مولانا آزاد کا اور مسمار کی جا رہی ہے وہ عمارت جہاں پہلی جنگ آزادی کے مجاہدین کا خون بہا۔

خواجہ حسن نظامی آگے لکھتے ہیں: ”میں یہ دیباچہ اسلام کو یا مسلمانوں کو یا بہادر شاہ کو اعتراضات سے بچانے کے واسطے نہیں لکھتا، خواجہ صاحب نے بہت ہی بہتر کیا کہ ایسا نہ کیا۔ ان کا یہ

جملہ یہ ثابت کر رہا ہے کہ جب وہ اس کتاب کو لکھ رہے تھے اس وقت تک ۱۸۵۷ کا سہرا اسلام، مسلمانوں اور بہادر شاہ کے سر تھا۔ اور اس کے بانی مبانی یہی تینوں تھے، اگر خواجہ صاحب اپنی تحریر میں ان کو بچانے کی کوشش کرتے تو آنے والے مورخین کو یہ جواز مل جاتا۔ ۱۸۵۷ عہد جدید کے مورخین کا میدان ہے اور اس پر زیادہ تر کام دہلی یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے مؤرخین نے کیا ہے جن میں خاص طور پر پروفیسر بپن چندرا اور پروفیسر سمپت سرکار وغیرہ ہیں۔

۱۸۵۷ سے متعلق ماخذ فارسی، اردو اور انگریزی زبان میں ہیں۔ فارسی اور اردو میں ۱۸۵۷ سے متعلق مخطوطات ہیں اور تقریباً ۸۰ ہزار دستاویزات ہندوستان کے مختلف آرکائیوز میں موجود ہیں۔ عہد جدید کا کوئی مورخ فارسی اور اردو سے واقف نہیں کہ جنھوں نے ۱۸۵۷ پر کام کیا ہے۔ انھوں نے یہ کام انگریزی زبان میں موجود ماخذ پر کیا ہے۔ ۱۵۰ سال گذرنے کے بعد بھی ہم فارسی اور اردو دستاویزات کا مطالعہ نہ کر سکے نتیجتاً ان کی کتابوں میں ۱۸۵۷ میں اسلام اور مسلمانوں کا جو رول رہا وہ غائب۔ اور ظاہر ہے کہ آزاد ہندوستان کے وزراء بھی ۱۸۵۷ سے متعلق انگریزی کتب کا ہی مطالعہ کرتے ہیں۔ ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ کے بعد انگریزوں کی اسلام دشمنی کی مثال یہ ملتی ہے کہ موری گیٹ کے نزدیک بیگم اورنگ آبادی کی مسجد کو مسمار کیا۔ جامع مسجد شاہ جہاں آباد کے سامنے بیگم اکبر آبادی کی مسجد کو مسمار کیا۔ جامع مسجد کو اصطبل بنا دیا گیا اور ۱۸۵۷ سے ۱۸۶۲ تک اس میں نماز نہ ہو سکی۔ نجیب آباد کی جامع مسجد کے صحن کو نیلام کر دیا۔ آج بھی وہاں مکانات ہیں اور گندی نالیاں مسجد کے صحن میں بہہ رہی ہیں۔ مدرسہ رحیمیہ کو زمین سے ملا دیا گیا، دہلی یا کسی اور شہر میں کسی مندر کو مسمار نہیں کیا۔ اگر مسلمان انگریزوں سے لڑے تو انھیں سزا دیتے لیکن مسجد تو پتھر سے تعمیر ہوئی تھی۔ مسجد تو نہیں لڑنے گئی تھی تو آخر مسجد کو کس گناہ کی سزا دی گئی، یہ ثابت کرتا ہے کہ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ اس مخالفت میں اسلام بھی مورد الزام ہے لہٰذا اسلامی عبادت گاہوں کو مسمار کرنا ضروری ہو گیا اور انھوں نے یہ کر کے دکھایا، لیکن ایسا لگتا ہے کہ خواجہ حسن نظامیؒ نے تو ان کو بے قصور ثابت کرنے سے گریز کیا، لیکن ۱۸۵۷ کے ۱۵۰ سال گذرنے کے بعد ہماری سرکار نے ۱۸۵۷ کے الزامات سے اسلام اور مسلمانوں کو بری کر دیا۔

۱۸۵۷ کا سانحہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس کو سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ ہم اس وقت ہی اس کو سمجھ پائیں گے کہ جب اس سے متعلق تمام ماخذوں کا مطالعہ کر لیں، ماوزی تنگ سے ۱۹۳۰ میں ایک فرنچ جرنلسٹ نے سوال کیا کہ آپ کی ۱۷۸۹ کے فرانس کے انقلاب کے بارے میں کیا رائے ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ اس پر ابھی کچھ کہنا بہت جلد بازی ہوگی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید جو اپنی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے انھوں دو کتابیں اسباب بغاوت ہند اور سرکشی ضلع بجنور ۱۸۵۸ اور ۱۸۵۹ میں لکھ کر شائع کر دیں اور انھوں نے اس پر پوری بحث کی، لیکن سرسید نے بھی اس کو "غدر" یا بغاوت "سرکشی" کا نام ہی دیا۔ مولانا آزاد نے اس کو عظیم مصیبت کہا، خواجہ حسن نظامی جو ۱۸۵۷ کے بیس سال بعد پیدا ہوئے، وہ بھی اس کو غدر، بغاوت ہی لکھتے ہیں، لیکن کہیں کہیں "انقلاب دہلی ۱۸۵۷" بھی لکھتے ہیں، غالب بھی غدر ہی لکھتے ہیں، میر انیس کہتے ہیں۔

یہ انقلاب غضب کا ہے یا علی فریاد
کہ مسجدیں تھیں جہاں، واں شراب خانہ ہوا

فارسی اور اردو تحریروں میں 'غدر'، بغاوت، سرکشی اور انقلاب ملتا ہے۔ ۱۹۰۷ میں ہم نے ۱۸۵۷ کی پچاسویں سالگرہ منائی ظاہر ہے کہ اس وقت برٹش حکومت تھی، لالہ ہردیال نے ایک اخبار "غدر" کے نام سے شائع کیا۔ لہٰذا ۱۹۰۷ تک 'غدر' کے

نام سے ہی ۱۸۵۷ کی شناخت رہی۔ ۱۹۰۸ میں وی۔ ڈی۔ ساورکر کی کتاب۔ ''ہندوستان کی جنگ آزادی'' شائع ہوئی۔ میرے اپنے مطالعہ کے مطابق پہلی مرتبہ ۱۸۵۷ کو جنگ آزادی سے نسبت دی گئی۔ لیکن بعد کے مورخین بھی اس کو ''غدر'' اور بغاوت لکھتے رہے۔

خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں ''میں نے آج سے چالیس سال پہلے جب یہ تاریخ لکھنی چاہی تو خوف کی یہ حالت تھی کہ ہر شخص مجھ کو ڈراتا تھا کہ جو قلم کار ایسی تاریخ لکھے گا پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا، مگر میں انگریزوں کی آزاد خیالی کو جانتا تھا اس لیے میں نے جرأت کر کے یہ تاریخ لکھ دی اور شروع کی چند مشکلات کے سواء کوئی تکلیف مجھے یہ تاریخ لکھنے کی وجہ سے انگریز حکومت نے نہیں دی۔ آپ کی ۱۸۵۷ کی تصنیفات کے ایڈیشن ۱۹۱۹ اور ۱۹۴۶ کے درمیان شائع ہوئے۔ یعنی یہ کتابیں آزادی سے پہلے شائع ہوئی تھیں۔ برٹش راج میں ان کی یہ تحریریں یقیناً ان کے ایک جرأت مندانہ قدم کی دلیل ہیں۔ اور نہ صرف برٹش حکمراں بلکہ مغل حکمراں بھی اپنی تنقید کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ عبدالقادر بدایونی کی کتاب منتخب التواریخ جب بدایونی کے انتقال کے بعد منظر عام پر آئی تو جہانگیر نے اس کے بیٹوں کو قید کر دیا۔ جعفر زٹلی نے ایک شعر لکھ دیا جس میں فرخ سیر کی حکومت کا مذاق اڑایا تھا۔ تو جعفر زٹلی کو قتل کرا دیا۔ خواجہ حسن نظامی کی ان تحریروں کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور لکھ بھی رہے ہیں ''شروع کی چند مشکلات کے سوا'' بالکل اسی طرح کا واقعہ سرسید کے ساتھ پیش آیا۔ حالی لکھتے ہیں ''اسباب بغاوت ہند کو سرسید نے پارلیامنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو ان کے دوست مانع آئے اور ماسٹر رامچندر کے چھوٹے بھائی رائے شنکر داس جو اس وقت مراد آباد میں منصف اور سرسید کے نہایت دوست تھے انھوں نے کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان کو معرض خطر میں نہ ڈالو۔ سرسید نے کہا'' میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں، پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔ رائے شنکر داس نے جب سرسید کی آمادگی بدرجۂ غایت دیکھی اور ان کے سمجھانے کا کچھ اثر نہ ہوا تو وہ آبدیدہ ہو کر خاموش ہو رہے۔ اور ایک کوشش سرسید کے خلاف ہوئی بھی۔ ''مسٹر سسل بیڈن نے جو اس وقت فارن سکریٹری تھے اس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم دانشوروں نے ۱۸۵۹ سے ۱۹۴۶ تک یعنی برٹش راج کے دوران ۱۸۵۷ پر فارسی اور اردو مخطوطات اور دستاویزات کی روشنی میں خوب لکھا جو آج خود ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے چاہے وہ سرسید کی اسباب بغاوت ہند ہو یا خواجہ حسن نظامی کی تحریریں ہوں۔

۱۵ راگست ۱۹۴۷ کو ملک آزاد ہو گیا۔ اب ہمیں آزادی مل گئی اور جن خطرات سے سرسید اور خواجہ حسن نظامی دوچار ہو سکتے تھے، اس کے باوجود انھوں نے خوب لکھا۔ لیکن آزادی کے بعد اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ پر کام ہوا لیکن ہندوستانی مورخین نے یہ کام برٹش رکارڈس کی بنیاد پر کیا جبکہ تاریخ نگاری کا یہ تقاضہ ہے کہ جب آپ کوئی تاریخ لکھیں تمام ماخذوں کا مطالعہ کریں لیکن ان مورخین نے ایسا نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی کتابوں سے اسلام اور مسلمانوں کا تذکرہ غائب ہو گیا۔ ہم نے بھی فارسی وارد و دستاویزات کی روشنی میں سرسید اور خواجہ حسن نظامی کی اطباع کرتے ہوئے کام نہیں کیا۔ لہٰذا ہم ۱۸۵۷ سے غائب ہو گئے۔ لیکن اب ضرورت اس بات (باقی صفحہ ۱۷ پر)

حضرت نظام الدین اولیاء: حیات اور خدمات

جناب وسیم احمد سعید

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب ہے تیری فیض عام ہے تیرا

حضرت سلطان المشائخ، سلطان جی، سلطان الاولیاء سلطان السلاطین، محبوب اولیاء التمش کی لخت جگر رضیہ سلطانہ کے دور حکومت میں ۶۳۶ھ میں صفر کے مہینے میں آخری بدھ کے روز پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا خواجہ علی بخاری، نانا خواجہ احمد سب کا تعلق نہ صرف خانوادہ رسالتؐ سے تھا بلکہ یہ سب اللہ والے لوگ تھے۔ حضرت محبوب الٰہی کے والد محترم خواجہ احمد مادر زاد ولی تھے۔ بادشاہ نے آپ کو بدایوں کا قاضی مقرر کیا تھا لیکن آپ جلد ہی اس منصب سے الگ ہو گئے تھے اور آپ کے روز و شب ذکر و فکر اور مشاہدہ حق میں بسر ہوتے۔ آپ کے دادا اور نانا دونوں بھائی تھے۔ مغلوں کی یورش کے زمانے میں بخارا سے لاہور آ گئے تھے۔ بعد ازاں یہ خاندان لاہور سے بدایوں آ گیا۔

پانچ سال کی عمر میں ہی والد محترم کا سایہ شفقت آپ کے سر سے اٹھ گیا اور خواجہ محمد کو کمسنی میں یتیمی کا داغ اپنے ننھے قلب و جگر پر اٹھانا پڑا۔ آپ کی والدہ محترمہ بی بی زلیخا نے شوہر کی وفات سے قبل خواب دیکھا تھا کہ کوئی اسے کہہ رہا ہے کہ بیٹے یا شوہر میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو اور انھوں نے بیٹے کو لے لیا جس کے کچھ عرصے بعد آپ کے والد محترم رحلت فرما گئے اور آپ کی تعلیم و تربیت اور پرورش کا بوجھ آپ کی والدہ محترمہ بی بی زلیخا کے ناتواں کندھوں پر آن پڑا، جو ایک نہایت عابدہ زاہدہ اور فرشتہ خصلت خاتون تھیں اور یہ اس مادر عظیم کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ خواجہ محمد نظام الدین کا قلبی رجحان اور میلان مذہب کی جانب ہو گیا، آپ کی والدہ محترمہ نے سوت کات کر آپ کی اور آپ کی ہمشیرہ جنت بی بی کی بڑی مشکل سے پرورش کی۔

حضرت محبوب الٰہیؒ جب ذرا بڑے ہوئے تو آپ کی والدہ محترمہ بی بی زلیخا نے آپ کو پڑھنے بٹھایا۔ آپ نے پہلے قرآن پاک ناظرہ پڑھا اور بعد ازاں دیگر کتب پڑھیں۔ خوش قسمتی سے آپ کو شمس الملک مولانا شمس الدین خوارزمی جیسے استاد کی رہنمائی حاصل ہوئی جن کا بلبن بادشاہ بھی بہت قدردان تھا اور انھیں وزیر بنا لیا تھا۔ مولانا شمس الدین نے آپ کی ذہانت، لیاقت اور انکساری دیکھتے ہوئے آپ کی تعلیم پر مزید توجہ دی اور اس پر آپ بارہ سال کی عمر میں ظاہری علوم میں کامل ہو کر روحانی مدارج کی طرف مائل ہو گئے۔

آپ کی والدہ محترمہ نے اپنے ہاتھ سے سوت کات کر آپ کے لیے دستار فضیلت بنوائی اور بدایوں کے علماء اور فضلا کو کھانے پر بلایا گیا جس میں شیخ جلال الدین تبریزی کے مرید اور مشہور صاحب کرامت بزرگ خواجہ علی بھی شریک تھے۔ حضرت خواجہ علی نے دستار کا ایک سرا پکڑا اور فرمایا کہ تم خود ہی باندھو۔ آپ نے سب بزرگوں کے سامنے دستار فضیلت باندھی اور خواجہ علی کی قدم بوسی کی۔ خواجہ علی اور دیگر علماء کرام نے آپ کو خصوصی دعائیں دیں۔

آپ نے یتیمی کا عرصہ جس عسرت اور تنگدستی سے گزارا وہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ماں کا لاڈلا دلارا اور خوددار کمسن خواجہ محمد

کتنے وقت فاقوں سے رہتا لیکن لب پر کوئی شکوہ نہ لاتا۔ ہم بھی صاحب اولاد ہیں اور اپنے بچوں کی چھوٹی چھوٹی فرمائشوں کے لیے ہر حد سے گزرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن صد آفریں ہے اس قابل فخر ماں پر جو فاقے کے روز اپنے اکلوتے اور یتیم لخت جگر کو یہ مژدہ سناتی ہے کہ بیٹے'' آج ہم اللہ کے مہمان ہیں''۔

حضرت نظام الدین اولیاء کی والدہ محترمہ بی بی زلیخا نے ان کی کمسنی اور یتیمی میں جس طرح پرورش کی وہ آج کی ماؤں کے لیے ایک روشن مثال ہے۔ انھوں نے تنگدستی غریبی اور لاچاری میں بھی ''تزکیہ نفس'' پر بھرپور توجہ دی اور خودداری عزت اور وقار پر حرف نہیں آنے دیا اور ایسی قابل فخر ماں کی تربیت کا ہی نتیجہ ہے کہ آگے چل کر یہی بچہ سلطان المشائخ اور محبوب الٰہی کہلایا۔ حضرت کے بچپن کا یہ واقعہ راجکمار ہردیو اور خواجہ حسن نظامیؒ کی زبانی سنتے ہیں۔

''جس وقت حضرت کے والد محترم خواجہ سید احمد کا انتقال ہوا، اس وقت ان کی عمر صرف پانچ سال کی تھی۔ گھر میں ایک والدہ، ایک بہن، ایک حضرتؒ، ایک والدہ کی لونڈی چار آدمی کھانے والے تھے۔ حضرتؒ کی والدہ اور بہن اور لونڈی مل کر چرخہ چلاتی تھیں اور سوت کات کر گزارا کرتی تھیں۔

خواجہ سید محمدؒ نے خود حضرتؒ کی زبانی یہ روایت بیان کی کہ ایک دن جب میں مکتب میں پڑھنے جانے لگا تو والدہ نے فرمایا ''دیکھ محمد آج ہم خدا کے مہمان ہیں۔'' حضرتؒ نے پوچھا خدا کے مہمان کا کیا مطلب ہے؟ والدہ نے فرمایا جس کسی گھر میں کھانے کی کوئی چیز موجود نہیں ہوتی اور اس گھر کے رہنے والوں کو فاقہ ہوتا ہے تو اس دن وہ سب خدا کے مہمان ہوتے ہیں۔ حضرتؒ نے پوچھا ''تو کیا ایسے گھر کو خدا کھانا بھیجتا ہے؟'' والدہ نے فرمایا ''ہاں خدا کے ہاں سے روح کی غذائیں آتی ہیں مگر وہ دنیا کے کھانوں کی طرح نہیں ہوتیں۔ وہ غذا باطن میں نور پیدا کرتی ہے اور اس سے دل میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ آج تم جب مکتب میں جاؤ اور وہاں امیروں کے بچے اپنا کھانا کھانے لگیں، جو ان کے نوکر اور غلام گھروں سے لاتے ہیں، اس وقت تم ان سب سے الگ اس طرح بیٹھ جانا کہ تم ان کے کھانے کو دیکھ سکو اور نہ وہ تم کو دیکھ سکیں کہ تم کھانا نہیں کھا رہے ہو۔''

حضرتؒ فرماتے تھے ''میں نے ایسا ہی کیا مگر بدایوں کے کوتوال کا لڑکا مکتب میں میرے برابر بیٹھا کرتا تھا اور میری اور اس کی بہت دوستی تھی۔ اس نے مجھے کھانے میں شریک نہ دیکھا تو وہ مجھے ڈھونڈھتا ہوا اس جگہ آگیا جہاں میں چھپا ہوا بیٹھا تھا اور اس نے کہا: ''چلو محمد، کھانا کھالو، کیا تمھارے گھر سے اب تک کھانا نہیں آیا؟'' میں جواب دیا: ''میں اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گا۔ یہی وجہ ہے کہ گھر سے کھانا نہیں آیا۔'' کوتوال کا لڑکا یہ بات سن کر چلا گیا۔ میں گھر میں آیا تو والدہ سے سارا قصہ بیان کیا۔ والدہ نے مجھے گلے لگالیا اور سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: ''بیٹا تم سید ہو اور سید بھوک میں صبر کرتے ہیں اور اپنا کھانا بھوکوں کو کھلا دیتے ہیں اور اپنا کپڑا ننگوں کو بانٹ دیتے ہیں۔''

دوسرے دن صبح کو جب میں مکتب جانے لگا تو تیسرا فاقہ تھا کیوں کہ آج بھی گھر میں کوئی چیز کھانے کی موجود نہ تھی۔ والدہ نے پھر چلتے وقت فرمایا ''بابا محمد! آج بھی ہم خدا کے مہمان ہیں۔'' یہ بات سن کر بھوک کی تکلیف جاتی رہی۔ اس وقت میری عمر چھ برس کی تھی۔ میں مکتب میں گیا اور کل کی طرح آج بھی دوسرے بچوں سے کھانے کے وقت الگ جا بیٹھا۔ کوتوال کا لڑکا پھر مجھے بلانے آیا اور اس نے کھانے کے لیے اصرار کیا۔ آج میں کوئی عذر نہیں کر سکا۔ خاموش رہا مگر بھوک کی تکلیف کے سبب میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کوتوال کا لڑکا سمجھا کہ میں اپنے گھر سے خفا ہو کر آیا ہوں اس لیے اس نے کہا ''آج میری اماں نے

بڑا اچھا حلوہ پکا کر بھیجا ہے۔ چلو میں تم کو کھلاؤں گا۔ میرے منہ سے بے اختیار یہ بات نکل گئی کہ جب میرے ابا زندہ تھے تو میری اماں بھی بڑا اچھا حلوہ بنایا کرتی تھیں۔ کوتوال کے لڑکے نے کہا ''تو جب سے تمھارے ابا مرے ہیں تمھاری اماں نے کبھی حلوہ نہیں بنایا؟'' یہ سوال سن کر میں نے پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور چاہا کہ ایسا جواب دوں کہ جھوٹ بھی نہ لگے اور میرے فاقے کا پردہ بھی فاش نہ ہو، اس لیے میں نے کہا تم ان سوالوں کو چھوڑو اور کھانا کھاؤ۔ میں اس وقت نہیں کھاؤں گا۔ کوتوال کا لڑکا نہ مانا اور مجھے زبردستی کھینچ کر لے گیا اور میں نے بھی اس کے اصرار کرنے سے اس کے ساتھ روٹی کھائی اور حلوہ بھی کھایا مگر مجھے اس بات کا صدمہ تھا کہ میری والدہ اور بہن نے کل سے کچھ نہیں کھایا، میں نے یہاں کھانا کیوں کھالیا؟ شام کو جب گھر میں آیا تو والدہ سے سارا قصہ بیان کیا۔ والدہ نے فرمایا'' کچھ حرج نہیں ہے۔ تم نے اگر اپنے دوست کے اصرار سے کھانا کھالیا تو کچھ برا کام نہیں کیا۔ خدا نے آج ہم کو رزق بھیج دیا ہے۔ لونڈی بازار سے سوت بیچ کر لائی ہے اور اب ہمارے پاس اتنا خرچ جمع ہوگیا ہے۔ ہم کل تمھارے لیے حلوہ بھی بنائیں گے اور تم اپنے مکتب میں لے جانا اور کوتوال کے لڑکے کو بھی کھلانا۔'' ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں کوتوال کے آدمی میرے گھر میں آئے اور کچھ غلہ، کپڑا شکر اور گھی اندر بھجوایا اور کہا'' کوتوال صاحب نے نذر بھیجی ہے۔'' والدہ یہ دیکھ کر رونے لگیں اور فرمایا ''یہ سب چیزیں واپس لے جاؤ، مجھے ایسی نذر کی ضرورت نہیں ہے'' کوتوال کے آدمیوں نے ہر چند اصرار کیا مگر والدہ نے وہ چیزیں قبول نہ کیں اور واپس کردیں۔ جب کوتوال کے آدمی وہ سامان لے کر واپس چلے گئے تو والدہ نے مجھے اور میری بہن سے مخاطب ہو کر فرمایا ''ہدیہ لینا سنت ہے اور میں نے نذر اور ہدیے کو واپس کردیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے یہ خیال آیا کہ کوتوال کے لڑکے نے اپنے باپ سے کہا ہوگا کہ ہم روزی کی تکلیف میں مبتلا ہیں اس واسطے میں نے سیدوں کی غیرت کے خلاف سمجھا کہ میں کوتوال کی امداد قبول کروں۔ اگر میں چاہتی تو اپنے باپ کے ہاں سے کچھ منگوالیتی مگر جب سے تمھارے باپ کا انتقال ہوا ہے میں نے کبھی اپنے والد کے گھر سے کچھ نہیں منگوایا کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ سیدوں کی طرح صبر و فکر سے زندگی بسر کروں اور اپنی محنت کی روزی کھاؤں اور تم دونوں کو کھلاؤں۔ اگر کوتوال سے میں یہ چیزیں لے لیتی تو کل میرا بچہ کوتوال کے لڑکے کی نظر میں حقیر اور ذلیل ہو جاتا اور کوتوال کا لڑکا یہ کہتا کہ آج محمد جو حلوہ اور کھانا لایا ہے، یہ میرے گھر کی خیرات کا ہے۔ دوسرے دن میں کھانا اور حلوہ لے کر مکتب میں گیا اور جب کھانے کا وقت آیا تو میں بھی دوسرے بچوں کے ساتھ شریک ہوا اور تقاضا کر کے کوتوال کے لڑکے کو حلوہ کھلایا، کوتوال کے لڑکے نے آہستہ سے میرے کان میں کہا ''تمھاری اماں نے ہماری نذر کیوں واپس کردی؟'' میں نے کہا ''تم نے شاید اپنے ابا سے ہماری غریبی کا حال بیان کیا ہوگا اس واسطے والدہ کو غیرت آئی۔''

بچہ عام طور پر ہمیشہ اپنے باپ کو فالو کرتا ہے اور وہی اس کا آئیڈل ہوتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے والد محترم بھی چونکہ قاضی رہے تھے اس لیے ننھے نظام الدین کے دل میں بھی قاضی بننے کا شوق جاگزیں تھا اور یہ شوق ان کی والدہ محترمہ نے ان کے دل میں اجاگر کیا تھا۔ لیکن تقدیر کھڑی مسکرا رہی تھی کہ اے فاقے اور ریاضت کرنے والی نیک خاتون، تیری محنتوں کا پھل تجھے بیٹے کے قاضی بننے کی شکل میں نہیں بلکہ سلطان المشائخ کی شکل میں ملے گا۔ تم تو بیٹے کو قاضی کی سیٹ پر متمکن دیکھنا چاہتی ہو۔ قادر مطلق اسے سلطان الاولیاء کے تخت پر جلوہ افروز اور محبوب الٰہی کا تاج اس کے سر پر رکھیں گے اور درجنوں بادشاہ ان کی چوکھٹ پر سر جھکانا اپنی شان سمجھیں گے۔

آپ کی والدہ محترمہ نے حضرت شیخ العلم بابا فرید گنج شکرؒ کے بھائی حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کے پاس بھیجا تھا کہ بادشاہ سفارش کر کے انھیں قاضی کا عہدہ دلوادیں۔ آپ حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کے ہاں پہنچے اور ان سے کہا کہ دعا فرمادیجیے کہ میں کہیں کا قاضی بن جاؤں۔ حضرت شیخ نے انھیں بغور دیکھا اور فرمایا قاضی نہ بنو کچھ اور بن جاؤ۔ میرے بھائی فرید الدین گنج شکرؒ کے پاس اجودھن چلے جاؤ۔ یہی تو وہ آگ تھی جو کب سے ان کے دل میں فروزاں تھی۔ وہ تو خود اسی کوچہ میں سر کے بل جانے اور جاں نچھاور کرنے کو تیار تھے۔ وہ قبل ازیں شیخ نجیب الدین متوکل سے اکثر و بیشتر شیخ العالم حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا احوال سنتے اور دل ہی دل میں ان کی محبت کے اسیر ہوتے چلے گئے۔

فرقت کی اک آگ تھی جوان کے دل میں دہک رہی تھی۔ وہ ہر نماز کے بعد دس بار خواجہ فرید اور دس بار مولانا فرید کا ورد کرتے۔ ان دنوں اجودھن (پاکپتن) کا سفر کچھ آسان نہ تھا زندگی اور زمانے کے تجربات سے ناآشنا اک معصوم اور بھولا بھالا نوجوان ہزار صعوبتیں اٹھا کر سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے اجودھن پہنچتا ہے جبکہ اس کی عمر کے لڑکے دیگر دنیاوی مشاغل اور امور میں مصروف تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاء اجودھن پہنچے۔ جوں جوں حضرت شیخ العالم بابا فرید گنج شکرؒ کا آستانہ قریب آرہا تھا ان کے دل کی دھڑکن بے توازن ہو رہی تھی۔ یہی تو وہ کوچہ تھا جہاں پہنچنا وہ سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے اور یہ کیسے ممکن تھا کہ بابا شیخ العالم حضرت بابا فرید گنج شکرؒ ان کے حال دل سے آگاہ نہ ہوتے۔ درگاہ پر پہنچ کر آپ نے اپنی جبیں نیاز اس چوکھٹ پر جھکا دی۔ حضرت نظام الدین اولیاء کو دیکھتے ہی حضرت بابا فرید گنج شکرؒ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ شعر پڑھا۔

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

(تیری جدائی کی آگ نے بہت دلوں کو کباب کر رکھا ہے اور تیرے اشتیاق کے سیلاب نے بہت سی جانوں کو خراب کر رکھا تھا)۔

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے بھی اس گوہر یکتا کو پہنچان لیا تھا۔ انھیں بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ دلی سے شیخ کی خدمت میں چل کر آنے والا یہ نوجوان بھی کوئی معمولی آدمی نہیں۔ چنانچہ حکم دیا کہ جماعت خانے میں ٹھہرایا جائے اور سونے کے لیے چارپائی کا انتظام بھی کیا جائے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی حضرت نظام الدین اولیاء پر خصوصی شفقت اور نظر تھی اور اسی کی بدولت انھوں نے تھوڑے عرصہ بعد آپ کو دہلی کی خلافت عطاء کردی۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی خصوصی عنایت اور شفقت سے کئی لوگ رشک حسد میں مبتلا ہو گئے۔ ملا یوسف جو بارہ سال سے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر تھے، نے شکوہ کناں ہوتے کہا حضرت میں بھی آپ کی چوکھٹ پر بارہ سال سے پڑا ہوں۔ آپ نے اس پردیسی کو اتنی جلدی خلافت عطا کردی اور میں اس سے محروم ہوں۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے پاس کھڑے ایک بچہ کو بلایا کہ میاں جاؤ سامنے اینٹوں کے ڈھیر سے میرے لیے ایک اینٹ اٹھالاؤ۔ بچہ خاموشی سے گیا اور آپ کے لیے ایک عمدہ اور ثابت اینٹ اٹھالایا، جس کے بعد حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے بچے سے کہا کہ ایک اینٹ مولانا نظام الدین دہلوی کے لیے بھی لے آؤ۔ چنانچہ وہ بچہ ایک اچھی اور ثابت اینٹ ان کے لیے بھی اٹھالایا۔ حضرت باباجی نے تیسری مرتبہ پھر بچے سے کہا کہ جاؤ ایک اینٹ ملا یوسف کے لیے بھی لاؤ۔ وہ بچہ پھر گیا اور جا کر اینٹوں کے ڈھیر کو بغور دیکھتا رہا اور وہاں سے ڈھونڈ کر ایک ٹوٹی ہوئی اینٹ کا ٹکڑا اٹھالایا اور لاکر ملا یوسف کے آگے رکھ دیا۔

حضرت باباجی نے فرمایا" دیکھ لیا ملا یوسف! جس کا جتنا حصہ ہوتا ہے، اسے وہی ملتا ہے" حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے پیرو مرشد حضرت بابا فرید گنج شکرؒ سے خصوصی فیض لے کر دہلی چلے گئے۔ حضرت بابا فریدؒ نے رخصت کے وقت فرمایا کہ حق تعالی نے تمھیں دولت علم، عقل و دانش اور عشق سے سرفراز فرمایا ہے اور جس کسی میں یہ تین صفات موجود ہوں وہی خلافت مشائخ کے لیے موزوں ہوتا ہے۔ نیز حضرت نظام الدین اولیاء کے لیے یہ دعا بھی فرمائی کہ تم وہ شجر سایہ دار ہو گے جس سے خلق خدا کو راحت ملے گی۔

حضرت نظام الدین اولیاء کو محفل میں حضرت خواجہ سید محمد اور راجکمار ہردیو کی حاضری افروز واقعہ خود راجکمار ہردیو اور حضرت خواجہ حسن نظامی کی زبانی سنیے۔ دستور کے موافق ہم دونوں نے زمین چومی اور مجلس کی ایک صف میں بیٹھنا چاہا۔ حضرتؒ نے ہم دونوں کو دیکھ کر تبسم فرمایا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ محمد میرے قریب بیٹھ جائیں اور ہردیو نصیر الدین محمود کے پاس بیٹھ جائیں، ہم دونوں سلام کر کے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد حضرتؒ اپنے مرید نصیر الدین محمودؒ کی طرف مخاطب ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ خدا کی صفات عین ذات ہیں اور ہم مسلمان صفات کو ذات سے جدا نہیں سمجھتے۔ نصیر الدین محمودؒ نے اپنا شعر سنایا اور عرض کی کہ غلام نے بھی اس بات کو اسی طرح ادا کیا ہے" او در من و من چوں بو بہ گلاب اندر" حضرتؒ نے فرمایا: ہاں ٹھیک ہے۔ اس غزل کے کچھ اور بھی اشعار سناؤ۔ مولانا نصیر الدین محمودؒ نے چند اشعار سنائے جو مجھے پورے یاد نہیں رہے۔ جو یاد رہے وہ یہ تھے:

بے کارم و با کارم، چوں مد بہ حساب اندر
گویانم و خاموشم، چوں خط کتاب اندر
گہ شادم و گہ غمگیں، از حال خودم غافل
می گریم و می خندم، چوں طفل بخواب اندر
در سینہ نصیر الدین جز عشق نمی گنجد
این طرفہ تماشا بیں، دریا بہ حباب اندر

یہ کلام سن کر حضرتؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور خواجہ سید محمدؒ کی طرف دیکھا۔ انھوں نے دست بستہ عرض کی: آج ہردیو نے ہندو عقائد اور خیالات کا ذکر مجھ سے کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں: خدا نے اپنی سب صفات دیوتاؤں اور دیویوں میں تقسیم کر دی ہیں۔ حضرت نے فرمایا: نصیر الدینؒ نے جو کلام سنایا، اس میں بہت اچھی مثالیں ہیں۔ ہم لوگوں کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ اس بات پر غور کریں کہ ہندوؤں کا عقیدہ کیا ہے اور مسلمانوں کا عقیدہ کیا ہے۔ ہم تو اسی حیرت میں سرشار ہیں کہ دریا حباب کے اندر کیوں کر سما گیا اور نصیر الدینؒ کے سینے میں عشق کے سوا اور کسی چیز کی گنجائش نہیں ہے اور ہم اس میں ہیں اور وہ ہم میں ہیں جیسے خوشبو کہ گلاب کے اندر بھی ہے اور باہر بھی ہے۔ خوشبو گلاب کے پھول سے جدا نہیں ہے مگر جدا ہے۔ حساب کے اندر جو مد کی لکیر کھینچی جاتی ہے وہ بیکار بھی ہے اور باکار بھی ہے۔ خط جو کتاب میں لکھا جاتا ہے، وہ بولتا بھی ہے اور خاموش بھی ہے۔ ہم اس زندگی کے دکھ سے روتے ہیں اور سکھ سے ہنستے ہیں مگر ہمارا رونا اور ہنسنا بچے کی طرح ہے جو نیند کی حالت میں کبھی روتا ہے اور کبھی ہنستا ہے یا روتا ہنستا دکھائی دیتا ہے اور حقیقت میں نہ روتا ہے اور نہ ہنستا ہے۔ ہردیو اصل چیز یہی پہچان ہے۔ ہم باہر کی پہچان میں مصروف رہتے ہیں اور خود اپنے اندر کی پہچان کو بھول جاتے ہیں۔ ہم اختیار والے بھی ہیں اور بے اختیار والے بھی ہیں، ہم موجود بھی ہیں اور موہوم و بے وجود بھی ہیں۔ بس ٹھیک کہا نصیر الدینؒ ہم باکار بھی ہیں۔ ہردیو ایک ہی ذات کی یہ سب تجلیاں ہیں۔ یہ سب روشنیاں ہیں یہ سب گھما گھمیاں ہیں۔

جب حضرتؒ نے یہ الفاظ زبان مبارک سے ارشاد فرمائے تمام حاضرین رونے لگے اور شیخ نصیر الدین محمودؒ نے

حضرتؒ کے قدموں میں سر رکھ دیا اور ان پر ایک وجد کی حالت طاری ہوگئی۔ حضرتؒ نے میری طرف نظر اُٹھائی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان آنسوؤں میں ساری کائنات مجھ کو جھولے کھاتی دکھائی دے رہی ہے۔ حضرتؒ نے مجھے فقط دیکھا، کچھ فرمایا نہیں مگر میں کانپنے لگا اور میں نے حضرتؒ کے آنسوؤں کے اندر سب کچھ دیکھا اور میں بے خود ہو کر حضرتؒ کے سامنے قدم چومنے کے لیے آگے بڑھا مگر جوں ہی کھڑا ہوا کسی چیز نے میرے اندر ناچنا شروع کر دیا اور میں بجائے اس کے کہ حضرتؒ کے قدموں پر سر رکھتا، مجلس میں ناچنے لگا۔ ہر چند چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو سنبھالوں اور اس گستاخی اور بے ادبی کی حرکت سے باز رہوں مگر میرا اختیار اور قابو مجھ پر نہ رہا تھا۔ مجھے آسمان وزمین حرکت، جنبش اور رقص میں نظر آتے تھے، میں بے ہوش ہوا تھا، سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سب کچھ سمجھ رہا تھا مگر میرے اندر کیا ہو رہا تھا؟ اور میں کیوں ناچ رہا تھا؟ اس کی وجہ میں نہیں لکھ سکتا کیوں کہ اس کا سبب مجھے معلوم نہ تھا۔ مجھے رقص میں دیکھ کر میرے حضرتؒ بھی کھڑے ہوگئے اور ساری مجلس کے حاضرین بھی کھڑے ہوگئے۔ خواجہ محمدؒ نے نہایت خوش الحانی سے شیخ نصیر الدین محمود کا مقطع گانا شروع کیا:

در سینہ نصیر الدین جز عشق نمی گنجد

ایں طرفہ تماشا بیں، دریا بہ حباب اندر

ہوش آنے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں نے بہت سا نشہ پیا ہے۔ ایک عجیب سرور میرے اندر پایا جاتا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوگیا۔ شیخ نصیر الدین محمودؒ اور خواجہ محمدؒ نے میرے دونوں بازو تھام لیے اور مجھے خواجہ محمدؒ کے گھر تک لے گئے اور وہاں جا کر بھی مجھے چاروں طرف سے یہی آوازیں آتی رہیں کہ در و دیوار گا رہے ہیں: جز عشق نمی گنجد۔

کچھ دیر کے بعد شیخ نصیر الدین محمودؒ چلے گئے اور خواجہ سید محمدؒ کے چھوٹے بھائی خواجہ سید موسیٰ میرے قریب بیٹھ گئے اور انھوں نے قرآن مجید بہت اچھی آواز سے پڑھنا شروع کیا۔ یہ دونوں بھائی قرآن مجید کے حافظ ہیں اور ان کی آوازیں بہت سریلی ہیں۔ قرآن مجید کی آیات کا مطلب تو میں نہ سمجھا مگر قوالی کا ایسا اثر میرے اندر تھا کہ ان آیات کے سننے سے میری کیفیت بہت دیر تک قائم رہی۔ پھر میں نے خواجہ سید محمدؒ سے پوچھا: جو آیتیں خواجہ موسیٰ نے پڑھیں ان کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے جواب دیا: میرے بھائی نے قرآن مجید کی سورہ یوسف کا ایک حصہ پڑھا ہے، جس میں حضرت یوسفؑ اور مصر کی زلیخا کی محبت کا ذکر ہے۔ چونکہ تم کو عشق کے مضمون پر کیفیت ہوئی تھی اس واسطے میرے بھائی نے قرآن مجید کی وہ آیات پڑھیں جن میں عشق کا بیان تھا تا کہ تمھاری کیفیت دگرگوں نہ ہو جائے۔ قوالی میں اگر کسی کو کسی خاص پر کیف ہو اور قوال اس مضمون کے خلاف کوئی دوسرا مضمون گانے لگے تو صاحب حال کی کیفیت خراب ہو جاتی ہے بلکہ بعض لوگ اس صدمے سے مر جاتے ہیں۔

خواجہ سید موسیٰ نے کہا: ''جب تم میرے بھائی اور شیخ نصیر الدین محمودؒ کے ساتھ حضرتؒ کی خانقاہ سے یہاں آنے لگے تو مجھے حضرتؒ نے حکم بھیجا کہ میں تمھارے سامنے سورہ یوسف کی آیات کی تلاوت کروں۔''

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے ایک درجن بادشاہوں کا دور دیکھا جن میں سے بہت آپ کے بے حد معتقد تھے جبکہ بعض بغض اور حسد کی آگ میں جل کر خود ہی نشانہ عبرت بن گئے۔ حضرت شیخ العالم بابا فرید گنج شکرؒ نے آپ کو یہ دعا دی تھی کہ خدا کرے تمھارے باورچی خانے میں روزانہ ستر من نمک خرچ ہو۔ چنانچہ رب الکریم نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور آپ کے لنگر خانہ میں ستر من نمک خرچ ہوتا اور ستر اونٹ روزانہ پیاز اور لہسن کے چھلکے باورچی خانہ سے باہر پھینکتے۔ امراء اور عقیدت مند آپ کی

درگاہ کے باہر سونے کی میخوں سے گھوڑے باندھ کر جاتے۔ اسلام میں شریعت ہی ایک ایسا جامع اور مکمل قانون ہے جس کے ذریعہ سے انسان انسانیت کے آخری مدارج حاصل کر لیتا ہے۔ شریعت کی تعلیم بھی یہی ہے کہ انسان نہ تو پرہیز گاری میں دنیا سے قطع تعلق کرے اور نہ آخرت پر دنیا کو ترجیح دے۔ اپنی خودی کو خدا کے سامنے جھکا دینے کا نام تصوف ہے۔ شریعت اور طریقت دو جداگانہ چیزیں نہیں بلکہ لازم وملزوم ہیں یعنی شریعت پہلے اور طریقت اس کے بعد۔ شریعت کی وہ ہی شراب وحدت اور محبت ہے جو آتش عشق کی بھٹی میں کشید ہو کر دو آتشہ اور سہ آتشہ بن جاتی ہے اور انسان اس لذت سے کچھ ایسا مخمور ہو جاتا ہے کہ صفات سے بے نیاز ہو کر خالص ذات کی طرف دوڑتا ہے اور اپنی خودی کو خدا کے حضور میں سرنگوں کر کے فنا کر دیتا ہے اور اسی کو عشق الٰہی یا تصوف کہتے ہیں۔

اولیاء کرام کا سب سے بڑا پیغام مخلوق خدا سے یکساں محبت تھا اور اسی مذہبی رواداری، بھائی چارے اور اخوت کا نتیجہ ہے کہ حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ جیسے برگزیدہ بندگان خدا کا فیض آج صدیوں بعد بھی اسی طرح جاری و ساری ہے۔ یہی وہ در ہیں جہاں بڑے بڑے جاہ جلال اور کروفر والے شہنشاہوں کی اکڑی گردنیں عاجزی سے جھکتی رہیں اور ان درگاہوں پر آج بھی مسلمانوں سے زیادہ ہندو، کرسچن اور غیر مذاہب کے لوگ حاضری دے کر ذہنی سکون حاصل کرتے اور من کی مرادیں پاتے ہیں۔ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کی زندگی کا بڑا مشن بلا تفریق مذہب وملت بندگان خدا سے یکساں محبت تھا، وہ ان کے زخمی دلوں پر اپنی شفقت اور دلجوئی کا مرہم رکھتے، انھوں نے بادشاہوں اور خواص کی بجائے دکھیارے، بھوک وافلاس اور صعوبتوں کے مارے ہوئے لوگوں میں رہنے کو ہمیشہ ترجیح دی۔

مسلم بادشاہوں نے پے در پے فتوحات اور کامرانیاں حاصل کی تو دولت وثروت کے ڈھیر لگ گئے اور معاشرہ ذہنی اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہونے لگا، خاص طور پر نوجوان نسل لہو ولعب اور بے راہروی کو اپنانے لگی۔ ایسے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے قول وفعل، محبت، راست بازی، صبر وتحمل، عفو ودرگزر، بھائی چارے، اخوت اور اخلاص سے ان کے لیے بطور عملی نمونہ پیش کیا جس نے بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ حق اور سچائی کا راستہ بتایا۔ آپ نے کبھی کسی کو زبردستی اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے قول وفعل سے غیر مسلموں کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور از خود ان کے دل میں اسلام کے لیے محبت، لگن اور جستجو کا جذبہ جاگزیں کیا۔ آپ کے گرد غیر مسلموں کا بھی اژدحام رہتا اور وہ آپ کے روز وشب کا نہایت انہماک حیرت اور دلچسپی سے مشاہدہ کرتے۔ اس سلسلہ میں راجکمار ہردیو کی مثال ہمارے سامنے ہے، جن کے روزنامچے چہل روزہ کا ترجمہ اس عظیم درگاہ کے قابل سپوت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے نظامی بنسری کے نام سے کیا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء کو شعر وادب سے غیر معمولی لگاؤ اور برجستہ شعر گوئی میں ملکہ حاصل تھا، کوئی ایک مصرع پڑھتا آپ پورا شعر پڑھ دیتے۔ آپ نے ایک رباعی بھی ارشاد فرمائی تھی۔ وہ شعر کو حکمت قرار دیتے تھے، لیکن مبالغے اور کذب کو ناپسند فرماتے تھے۔ آپ کا ارشاد تھا کہ ہر اچھی بات جو سنی جاتی ہے اس سے ذوق اور لذت حاصل ہوتی ہے اور جو بات نثر میں ہوتی ہے وہ بات اگر نظم کے قالب میں ڈھال دی جائے تو اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ شعر نہایت لطیف چیز ہے لیکن اگر اس سے مدح کا کام لیا جائے تو اس کا لطف ختم ہو جاتا ہے۔ بقول حضرت خواجہ نظامیؒ، راجکمار ہردیو کے مطابق حضرت سلطان المشائخ نے ہندی زبان رائج کرنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ جماعت تیار کی تھی۔

جس بول چال کو آج کل اردو کہتے ہیں، اس کو شروع میں ہندی کہا جاتا تھا کیونکہ حضرت امیر خسروؒ نے جو حضرت سلطان المشائخ کے حکم سے ''خالق باری'' لکھی تھی، اس میں جگہ جگہ ہندی کا لفظ لکھا ہے۔ آج کل کوئی کہتا ہے کہ دکن اور گجرات کے پرانے شاعر ولی نے اردو ایجاد کی تھی۔ کوئی کہتا ہے کہ شاہ جہاں کے زمانے میں لال قلعہ دہلی سے اردو کی ابتداء ہوئی۔ اردو کی بنیاد اہل پنجاب اور اہل اودھ اور اہل دکن اور گجرات نے مل جل کر رکھی تھی کیونکہ حضرت خواجہ سید محمدؒ پنجاب کی پیدائش اور حضرت امیر خسروؒ یوپی کی پیدائش تھے اور راجکمار ہردیو اور ان کے بھائی دکن اور گجرات سے تعلق رکھتے تھے اور خود حضرت سلطان المشائخ کے والدین لاہور میں اور وہ یوپی کے شہر بدایوں میں پیدا ہوئے تھے اور ان سب نے مل کر جو کام زبان کی ایجاد کا شروع کیا تھا، وہ دہلی میں کیا تھا اور اس واسطے اہل دہلی بھی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اردو کی بنیاد دہلی میں رکھی گئی تھی۔

چاندرات کو سلام کے لیے آپ کو زبردستی اپنے محل میں بلانے کا حکم دینے والے سلطان قطب الدین خلجی کا سر، اس کا پسندیدہ غلام خسرو خان ہی تلوار سے قلم کر دیتا ہے۔ ہنوز دلی دور است کی بازگشت تو آج بھی تاریخ کے دریچوں سے بڑی واضح سنائی دیتی ہے۔ کشف و کرامات کے کس کس واقع کا ذکر کیا جائے۔ آپ کی پوری زندگی ہمارے آج کے حکمرانوں اور اللہ والوں، دونوں کے لیے الگ الگ نمونہ ہے۔ ہزاروں لاکھوں افراد آپ کے در پر روزانہ حاضری دینے کھانے پینے کے علاوہ من کی مراد پاتے ہیں، اگر آپ کے سیاسی مقاصد ہوتے تو آپ گے ایک ادنیٰ اشارے پر بادشاہوں کے تخت بآسانی الٹ سکتے تھے لیکن ہمارے سلطان المشائخ کو دنیاوی جاہ جلال سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ آپ آفات سماوی اور قحط کے دنوں میں مخلوق خدا میں غلہ اور نقدی تقسیم فرماتے۔ آپ کی خدمات اور تعلیمات کے ذکر کے لیے کئی کتب درکار ہیں۔

طوطی ہند حضرت امیر خسروؒ کے ذکر کے بغیر یہ مضمون ادھورا رہے گا۔ حضرت امیر خسروؒ حضرت نظام الدین اولیاء سے روحانی فیض پانے والوں میں شامل تھے اور پیر و مرشد کی تربیت کا اثر تھا کہ برسوں صائم الدہر رہے اور عشق الٰہی کی ایسی سوزش تھی کہ سینے پر سے کپڑا جل جاتا تھا۔ حضرت شیخ المشائخ کو بھی حضرت امیر خسروؒ سے اس قدر محبت تھی کہ وصیت فرمائی تھی کہ خسرو میرے مزار کے قریب نہ آنے پائیں ورنہ بے تاب ہو کر میرا جسم باہر آجائے گا۔ چنانچہ امیر خسرو مزار سے دور ہی بیٹھا کرتے۔ محبوب الٰہی کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ فرمایا اگر شریعت میں اجازت ہوتی تو میں یہ وصیت کرتا کہ امیر خسرو کو بھی میری قبر میں دفن کیا جائے۔

آگرہ میں تاج محل تعمیر ہوا تو اس کے طول و عرض میں پورا ایک شہر آباد ہوگیا اور دو دہائیوں سے زائد عرصہ تک یہاں جمع ہونے اور بچ جانے والے قیمتی پتھروں سے لوگوں نے گرد و نواح میں محلات بنالیے اور اپنے در و بام کو ان قیمتی اور منقش پتھروں سے سجالیا۔ میرے پیارے حضرت نظام الدین اولیاءؒ بھی دلی کا ایسا روحانی تاج محل ہیں جن کے اردگرد اور طول عرض میں حضرت امیر خسرو، حضرت نصیر الدین چراغ محمود دہلوی، حضرت حسن سجزیؒ، مولانا شمس الدین یحیٰؒ، مولانا علاؤ الدین نیلی، مولانا فخر الدین زرادی، حضرت خواجہ امام، مولانا شہاب الدین امام، قاضی محی الدین کاشانی، مولانا وجیہہ الدین یوسف چندیری، مولانا برہان الدین غریب، خواجہ رفیع الدین ہارونی، خواجہ ابوبکر مصلیٰ دار خاص، خواجہ ضیاء الدین برنی، مولانا شمس الدین یحیٰؒ، خواجہ عزیز الدین صوفی، امیر خورد سید محمد کرمانی، شمس سراج عفیف اور خواجہ جہاں احمد ایاز المعروف راجکمار ہردیو کے محلات بقعہ نور اور روحانی کشف و کرامات کا منبع ہیں۔ ان مریدین اور خلفاء کرام میں شاعر

اور مصنف بھی تھے۔ جن میں طوطی ہند حضرت امیر خسروؒ کی دوسو تصانیف، بشمول افضل الفوائد، خواجہ سید حسن علاء سجزی کی فوائد الفواد، مولانا خواجہ سید محمد امام کی انوار المجالس، مولانا فخر الدین زراوی کی اصول السماع، ضیاالدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی، خواجہ سید قاسم کی لطائف تفسیر، راجکمار ہردیو کی چہل روزہ، خواجہ سید عزیز الدین کی مجموعہ الفوائد، حضرت خواجہ عزیز الدین صوفی کی تحفۃ الاسرار شامل ہیں اور ان سب کتابوں کا بیشتر حصہ حضرت نظام الدین اولیاء کی حیات وتعلیمات اور خدمات پر مبنی ہے، ہے کوئی اور ایسی درگاہ جسے ان جیسے جاں نثار اور پروانے ملے ہوں؟

وصال فرمانے سے قبل پورے چالیس روز آپ بستر علالت پر رہے اور اس دوران آپ نے کچھ بھی نہ کھایا، بلکہ کھانے کی بوتک نہ سونگھی، ایک آنسو تھے جو حضرت کی چشم مبارک سے مسلسل جاری تھے۔ بے ہوشی اور غشی کے دوروں کے دوران بھی بار بار یہی دریافت فرماتے رہے کہ میں نے نماز پڑھی یا نہیں؟ وصال کے روز، نور کی ایک تحریر آپ کے سینہ مبارک پر ظاہر ہوئی، آخری الفاظ آپ نے یہ ادا کیے کہ مجھے پکڑ کر تعظیم کے لیے بیٹھاؤ کیونکہ حضرت شیخ العالم بابا فرید گنج شکر تشریف لائے ہیں۔ اس کے بعد یہ آفتاب رشد وہدایات دہلی سے پردہ کر گیا۔

لیکن آج سات صدیوں بعد بھی دہلی کے اس ماہ تاباں کی روشن کرنیں اس خطے کو منور کر رہی ہیں اور آپ دیکھ لیں کہ ان کا فیضان آج بھی بدستور اسی طرح جاری ہے اور لاکھوں دیوانے کس طرح پروانہ وار اس شمع پر نثار ہوتے ہیں۔

ستارے عشق کی تیری کشش سے ہیں قائم
نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا

☆☆☆

(صفحہ ۸ کا بقیہ)

کی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یا جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۸۵۷ پر کوئی ایسا پروجیکٹ تیار کریں تا کہ فارسی وار دو دستاویزات کی روشنی میں ۱۸۵۷ پر کام ہو سکے۔ صرف دوسروں پر الزام لگانے سے کام نہیں چل سکتا کہ ان کی کتابوں میں اسلام، مسلمان اور علماء کا ۱۸۵۷ میں اہم رول ہے، وہ غائب ہے۔ حد تو یہ ہوگئی کہ آج ۲۹ ردسمبر ۲۰۰۷ ہے اور دو دن بعد ۲۰۰۷ ختم ہو جائے گا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جس کے بانی نے ۱۸۵۷ پر دو کتابیں تحریر کیں، کوئی سیمینار بھی ۱۸۵۷ پر نہ کرا سکی۔

خواجہ حسن نظامیؒ کی ۱۸۵۷ پر یہ تصنیفات بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور کیونکہ اس قدر ماخذوں سے استفادہ کیا ہے کہ ان کی یہ تحریریں بھی ماخذ ہی کا درجہ رکھتی ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اسی سال لاہور سے ان کے تمام مضامین کا ایک ضخیم مجموعہ شائع ہوگیا ہے، جس کی بنیاد پر ایک تحقیقی مقالہ پیش ہوسکتا ہے۔ ۱۸۵۷ کی ۱۵۰ویں سالگرہ پر ۱۸۵۷ پر لکھی گئی کتابوں کے Reprints تو کافی شائع کیے لیکن نئی تحریروں کی تعداد بہت کم ہے۔ اب ہمیں ان تمام ماخذوں پر کام کرنا چاہیے تا کہ جب آنے والی نسل ۲۰۵۷ میں ۱۸۵۷ کی دوسوویں سالگرہ منائے تو کچھ نئی نوعیت کا کام ۱۸۵۷ پر موجود ہو، تب ہی ہم ان دو دانشوروں سرسید اور خواجہ حسن نظامی کو خراج عقیدت پیش کر سکیں گے۔

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ بحیثیت مؤرخ

جناب وسیم احمد سعید

مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ اردو ادب کا ایسا درخشندہ ستارہ ہیں جس کی روشنی ایک صدی بعد بھی اس کے اوراق کو جگمارہی ہے۔ ان کی شخصیت کے اتنے ڈائی مینشن اور پہلو ہیں جن میں سے ہر ایک نہ صرف اپنی جگہ ایک مسلمہ حیثیت رکھتا ہے بلکہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف بھی ہے۔ بحیثیت انشاء پرداز، نثر نگار، خاکہ نگار، صحافی، کالم نویس، سفرنامہ نگار، روزنامچہ نگار، افسانہ نگار، پیر طریقت، مترجم و مفسر قرآن اور مقرر، انھوں نے ہر شعبہ میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

شخصیت ایسی ہمہ گیر ہے خواجہ کی مرے
ایک ہے خواب مگر سینکڑوں تعبیریں ہیں

تاریخ نویسی میں متخیلہ نہیں آسکتا اور آرائش نہیں ہوتی اور جذبات کے اظہار سے بھی کام نہیں لیا جاسکتا۔ تاریخ غیر جانبدار رہ کر لکھی جاتی ہے اور اس میں تاثر اور جذبات شامل نہیں ہوتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خواجہ حسن نظامیؒ نے تاریخ سے خام مواد لے کر اسے افسانوی پیرائے میں شائستگی، بے ساختگی، برجستگی، بے تکلف اور بے تکان اسلوب، کمال ہنرمندی سے پیش کیا کہ یہ کردار چشم زدن میں صدیوں کا سفر طے کر کے ہمارے سامنے مجسم آکھڑے ہوتے ہیں اور یہ ہنر انھیں ایسے ہی حاصل نہیں ہوگیا تھا کیونکہ جب تک سارے سُر سچے نہ لگیں تو گلے میں نور نہیں اترتا اور دل کے سب زخم لو نہ دیں تو حرف میں روشنی نہیں اترتی۔

دل دکھا ہے تو کھلی میرے وجدان کی آنکھ
اک شگوفہ تھا کہ شبنم کے جگانے سے کھلا

انھوں نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو ۱۸۵۷ میں دہلی، قلعہ معلی پر بیت جانے والی تباہی کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھے اور مغل شہزادے شہزادیوں کی جگر خراش اور دلدوز داستانیں ان کی زبان سنیں اور مغلیہ خاندان کے بچے کھچے افراد کو دو وقت کی روٹی کے لیے دست ناز دراز کرتے اور در در کی ٹھوکریں کھاتے دیکھا۔ یہی نہیں فرنگی راج کی عیاری اور مکاری کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ جس ننھی شہزادی کا یہ خالی قصہ لکھا گیا ہے اس کی ماں پر غدر کے زمانے میں بڑی بپتا پڑی تھی اس لیے وہ سچا اور اصلی قصہ بھی یہاں درج کیا جاتا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

غدر میں میری عمر سات برس کی تھی۔ اماں مجھ کو تین برس کا چھوڑ کر مرگئی تھیں، ابا کے پاس رہتی تھی، چودہ برس کا میرا ایک بھائی جمشید شاہ نامی تھا مگر ہاتھ پاؤں کے اٹھان سے بیس برس معلوم ہوتا تھا۔ ابا جان نابینا ہوگئے تھے اور ہمیشہ گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ ڈیوڑھی پر چار نوکر اور ایک داروغہ۔ گھر میں تین باندیاں اور ایک مغلانی کام کرتی تھیں۔ حضرت بہادر شاہ ہمارے رشتہ کے دادا ہوتے تھے۔ اور ہمارا سب خرچ شاہی خزانہ سے ملتا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک بکری پلی ہوئی تھی۔ ایک دن میں نے اس کے بچہ کو ستانا شروع کیا۔ بکری نے بگڑ کر میرے ٹکر ماردی۔ میں نے غصہ میں دست پناہ گرم کر کے بکری کے بچہ کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ وہ بچہ تڑپ کر مرگیا۔

کچھ دن کے بعد غدر پڑا۔ بادشاہ کے نکلنے کے بعد ابا کے ساتھ شہر سے نکلے۔ پالکی میں سوار تھے اور جمشید بھائی گھوڑے پر ساتھ ساتھ تھے۔ دلی دروازے سے نکلتے ہی فوج والوں نے پالکی پکڑلی۔ بھائی کو بھی گرفتار کرنا چاہا۔ انھوں نے تلوار چلائی۔ ایک

افسر کو زخمی کیا۔ آخر زخموں سے چور چور ہوکر گرے۔ سامنے دو نوکدار پتھر پڑے تھے۔ وہ آنکھوں میں گھپ گئے اور بھائی نے چیخیں مار مار کر تھوڑی دیر میں جان دے دی۔ بھائی کی بے قرار آواز سن کر ابا میاں بھی پالکی سے نیچے اتر آئے اور ٹٹول ٹٹول کر لاش کے پاس گئے اور پتھر سے سر ٹکرا کر لہولہان کرلیا، یہاں تک کہ ان کا وہیں خاتمہ ہوگیا۔

اس کے بعد فوج والوں نے ہمارا سب سامان لے لیا اور مجھ کو بھی پکڑ لیا۔ چلتے وقت باپ اور بھائی کی لاش سے چمٹ کر خوب روئی اور ان کو بے گوروکفن چھوڑ کر مجبوراً فوج کے ساتھ چلی گئی۔

ایک دیسی سپاہی نے افسر سے مجھے مانگ لیا اور اپنے گھر مجھ کو لے گیا، جو پٹیالہ کی ریاست میں تھا۔ اس سپاہی کی بیوی بڑی بدمزاج تھی۔ وہ مجھ سے برتن منجھواتی، مصالحہ پسواتی، جھاڑو دلواتی اور رات کو پاؤں دبواتی تھی۔ شروع شروع میں ایک رات دن بھر کی محنت سے تھک گئی تھی۔ پاؤں دبانے میں اونگھا گئی تو اس جلادنی نے دست پناہ گرم کر کے میری بھوؤں پر رکھ دیا جس سے پلکیں جھلس گئیں اور بھوؤں کی چربی نکل آئی۔ میں نے ابا کو پکارنا شروع کیا، کیونکہ مجھے اتنی سمجھ نہ تھی کہ مرنے کے بعد پھر کوئی آیا نہیں کرتا۔ جب ابا نے جواب نہ دیا تو میں اس عورت کے ڈر کے مارے سہم کر چپ ہوگئی لیکن اس پر بھی اس کو ترس نہ آیا اور بولی پاؤں دبا۔ زخموں کی تکلیف میں مجھ کو نیند نہ آتی تھی اور پیر بھی نہ دب سکتے تھے مگر قہر درویش برجان درویش میں نے اسی حالت میں پاؤں دبائے۔

سویرے مسالے پیسنے میں مرچوں کا ہاتھ زخموں میں لگ گیا۔ اس وقت مجھ کو تاب نہ رہی اور زمین پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگی، مگر بے رحم عورت کو تب بھی کچھ خیال نہ آیا اور بولی ''چل مکار کام سے دم چراتی ہے'' اور یہ کہہ کر پستی ہوئی مرچیں زخموں پر مل دیں۔ اس وقت مجھ کو مارے تکلیف کے غش آگیا اور رات تک ہوش نہ آیا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو بچارا سپاہی میرے زخموں کو صاف کر کے دوا لگا رہا تھا۔

تھوڑے دن کے بعد سپاہی کی بیوی مرگئی اور اس نے نئی شادی کی جو مجھ پر بہت مہربان تھی۔ اسی کے گھر میں میں جوان ہوئی اور اسی نے میری شادی ایک غریب آدمی سے کردی۔ دو برس تک میرا خاوند زندہ رہا۔ اس کے بعد مرگیا۔ بیوہ ہوکر دلی چلی آئی۔ کیونکہ وہ سپاہی بھی مرگیا تھا اور اس کی بیوہ نے دوسری شادی کرلی تھی۔ دہلی میں آکر میں نے بھی اپنی قوم میں دوسری شادی کرلی، جس سے فقط ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس خاوند کی پانچ روپے ماہوار انگریزی سرکار سے پنشن تھی مگر تنخواہ قرضہ میں چلی گئی اور اب ہم نہایت عسرت اور تنگدستی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

یہ محض غم واندوہ کی کہانیاں ہی نہیں بلکہ شر اور خیر کی حدود کا تعین کرتی اور شرف انسانی کی اعلیٰ اقدار کا درس بھی دیتی ہیں۔ یوں وہ ایک مصلح قوم بن کر سامنے آتے ہیں جبکہ تنہا بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ ہی اپنی تاریخی، علمی اور ادبی حیثیت کے لیے کافی ہے۔

خواجہ حسن نظامیؒ نے تاریخ کو افسانوی انداز میں لکھا اور اس سلسلہ میں کوئی حوالہ نہیں دیا، جبکہ تاریخ نویس کو بالکل غیر جانبدار رہ کر تاریخ رقم کرنی چاہیے۔ کسی ایک فریق کی طرف اس کا جھکاؤ اس کی غیر جانبداری پر سوالیہ نشان لگا دے گا۔ ہم اس سلسلہ میں ''بخاری شریف'' کی مثال دے سکتے ہیں کہ امام بخاری صاحب نے ایک ایک حدیث کی تصدیق کے لیے کس قدر صعوبتیں اٹھائیں اور تمام حوالہ جات جمع کیے۔ جب ہم ان کے ہم عصروں مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، شیخ عبدالقادر، مولانا اشرف تھانوی، مولانا محمد الیاس دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریا آبادی، شیخ الہند مولانا محمود الحق، مولانا محمد علی جوہر، پیر مہر علی شاہ اور حضرت علامہ اقبالؒ پر نظر ڈالتے ہیں تو ان سب کی موجودگی میں خود کو منوانا کوئی آسان کام

نہ تھا لیکن وہ دبستان ادب کی اس کہکشاں کے سب سے منور اور روشن ستارہ اور اردو زبان کے مجدد کہلائے۔ ان کے بارے میں شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ''خواجہ حسن نظامیؒ درد مند ہیں اور ہر درد مند کا انداز تحریر موثر ہوتا ہے۔''

طوطی ہند حضرت امیر خسروؒ کو جو شرف مقبولیت اور فیضان محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے در سے حاصل ہوا، لگتا ہے کہ اس کا سلسلہ حضرت امیر خسرو کی وفات کے ساڑھے چھ سو سال تک منقطع ہو گیا تھا، گرچہ اس دوران سینکڑوں ادباء شعرا آئے لیکن کوئی بھی حضرت امیر خسرو کی ہمسری نہ کر سکا، ہم دیکھتے ہیں کہ اس دربار سے نسبت کی بدولت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے مذہب، تصوف، ادب اور کلچر کے ملاپ سے جو مخیلہ تخلیق کیا اس نے انھیں سچ مچ ''خسرو ثانی'' بنا دیا اور یہ سب حضرت نظام الدین اولیاؒ کی فیضان نظر اور ان سے نسبت کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے مسلمانوں میں روحانیت کی روح کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں حلقہ نظام المشائخ اور سلسلہ چشتیہ نظامی کے لیے ان کی بے مثال کاوشیں ناقابل فراموش ہیں۔ حضرت خواجہ حسن نظامی نے درگاہ حضرت نظام الدین الیاءؒ سے نسبت کو ہمیشہ ترجیح دی اور سینکڑوں مزارات کے آثار کی مرمت کرائی اور ان کے کتبے لگوا کر تاریخی معاونت کا فریضہ انجام دیا۔

خواجہ حسن نظامیؒ گنگا جمنی تہذیب کے پیامبر تھے۔ انھوں نے متھرا، اجودھیا، بنارس، گیا، بدھ گیا، ہردوار، رشی کیش میں ہندو مندروں کے دورے کیے اور ہندو سادھوؤں سے ملاقاتیں کیں، تیرتھ یاترا کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا، رام چندر جی اور کرشن جی اور ان کی تعلیمات کو اردو میں پیش کیا۔ یہاں ہم حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا موازنہ شہزادہ دار الشکوہؒ قادری سے کرتے ہیں جسے اس طرح کی جسارت کی سخت قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ خواجہ حسن نظامیؒ پر بھی کفر کا فتویٰ لگ گیا اور پانچ سال کے لیے برادری سے الگ کر دیے گئے۔

یوں تو حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے سینکڑوں تصانیف لکھیں لیکن ان کی تصنیف ''بیگمات کے آنسو'' کو ان کی دنیاوی کمائی اور راجکمار ہردیو کے روزنامچے ''چہل روزہ'' اور ''نظامی بنسری'' کو ان کی روحانی کمائی کہا جا سکتا ہے اور جو شہرت اور پذیرائی ''نظامی بنسری'' کو ملی وہ کسی اور تصنیف کے حصہ میں نہ آئی اور یہ سب حضرت محبوب الٰہیؒ سے عقیدت اور نسبت کا اعجاز تھا۔

خواجہ حسن نظامیؒ نے اردو ادب میں روزنامچے کو بھی متعارف کرایا اور ان کے یہ روزنامچے دراصل ان کی تاریخ نویسی کا ذریعہ بھی ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''میرا روزنامچہ میری ذات کے ساتھ ہندوستان کی تمدنی، سیاسی اور مذہبی تاریخ کا ایک ذخیرہ ہے، اس لیے میں اس میں وہ تمام باتیں لکھا کرتا ہوں جو آئندہ زمانے میں مؤرخ کے لیے مواد بن جائیں۔''

سو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی ان تاریخی تحریروں سے ہزاروں افراد کے قلمی چہرے، ہزاروں انسانوں کے انتقال کی تاریخ، وقت اور ان کے مدفن کا حال خواجہ حسن نظامیؒ کے ذریعہ ہم تک پہنچا۔ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ تاریخی کرداروں کے حوالے سے قارئین کو تاریخ سے جو رغبت اور انسیت دلائی وہ بھی کم مؤرخین کے حصہ میں آئی ہوگی۔ حد تو یہ ہے کہ انھوں نے ان کے افسانوں نے نئی نسل میں تاریخ نویسی کا ذوق پیدا کیا اور اس سلسلہ میں انھیں افسانوی، تاریخی مواد فراہم کیا۔ انھوں نے عام فہم، سادہ و دلکش اور موثر اسلوب اور تشبیہ و استعارہ سے جاہل لوگوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ نصف صدی تک دہلی کا محور اور وہاں کی سب سے نمایاں شخصیت رہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں ان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے دہلی مرحوم کی تاریخی اور تمدنی زندگی کو سوز و گداز کے ساتھ خون قلم میں ڈبو کر

اس طرح لکھا کہ اہل ہندان کا ایک ایک لفظ آنسوؤں سے وضو کر کے پڑھتے تھے۔ انھوں نے مغل دربار کے آخری دنوں کو آفرینی سے زندہ تاریخ بنا دیا۔ وہ دہلی مرحوم کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کی آخری یادگار 'امین' ترجمان اور وارث تھے جوان کے ساتھ ہی پیوندزمین ہوگئی۔ یہاں ان کی ایک اور تصنیف کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ اس کتاب سے خواجہ کی تاریخی شعور کا بھرپور پتہ چلتا ہے۔ وہ کتاب ہے ''تاریخ فرعون'' جس میں مصر کی تہذیب کی پانچ ہزار سالہ تاریخ رقم کی گئی ہے۔ اس کتاب میں مستند ماخذ سے حوالے بھی پیش کیے گئے ہیں اور قرآن کی تفاسیر سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب صرف مصر کی ہی نہیں ہندوستان کی تہذیب کی تاریخ پیش کرتی ہے۔ کتاب کے مقدمے میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

''ناظرین جب اس کتاب کو پڑھیں گے تو ان کو جگہ جگہ ایسے واقعات ملیں گے جن سے ظاہر ہوگا کہ مصری قوم اور ہندو قوم کے رسم ورواج میں بہت زیادہ مشابہت تھی اور چوں کہ میں ہندوستان کی تاریخ میں وہ سب کلچر بیان کرنا چاہتا ہوں، جن کا تعلق ہندوستانی باشندوں سے ہے، اس واسطے میں نے مصر کی تاریخ کو مقدم رکھا ہے۔''

اس کتاب میں خواجہ صاحب نے مصر کے شاہی خاندان اور حکومت کرنے کی مدت بھی درج کی ہے اور پھر اس کے مطابق ان تمام فرعونوں کے بارے میں تفصیلات پیش کی ہیں۔ یہاں صرف شاہی خاندان کی فہرست پیش ہے۔

شاہی خاندان اور حکومت کرنے کی مدت

۱۔ پہلا خاندان 5000 پانچ ہزار سے 4750 چار ہزار سات سو پچاس (ق م)

۲۔ دوسرا خاندان 4750 چار ہزار سات سو پچاس سے 4450 چار ہزار چار سو پچاس برس (ق م)

۳۔ تیسرا خاندان 4450 چار ہزار چار سو پچاس سے 4240 چار ہزار دو سو چالیس (ق م)

۴۔ چوتھا خاندان 4240 چار ہزار دو سو چالیس سے 3950 تین ہزار نو سو پچاس (ق م)

۵۔ پانچواں خاندان 3950 تین ہزار نو سو پچاس سے 3700 تین ہزار سو (ق م)

۶۔ چھٹا خاندان 3700 تین ہزار سات سو سے 3500 تین ہزار پانچ سو (ق م)

۷۔ ساتواں خاندان 3500 تین ہزار پانچ سو سے ...... ختم کا زمانہ معلوم نہیں ہوا (ق م)

۸۔ آٹھواں خاندان 3500 تین ہزار پانچ سو سے 3200 تین ہزار دو سو (ق م)

۹۔ نواں خاندان 3200 تین ہزار دو سو سے 3150 تین ہزار ایک سو پچاس (ق م)

۱۰۔ دسواں خاندان 3150 تین ہزار ایک سو پچاس سے 3100 تین ہزار ایک سو (ق م)

۱۱۔ گیارہواں خاندان 3100 تین ہزار ایک سو سے 3050 تین ہزار پچاس (ق م)

۱۲۔ بارہواں خاندان 3050 تین ہزار پچاس سے 2840 دو ہزار آٹھ سو چالیس (ق م)

۱۳۔ تیرہواں خاندان 2840 دو ہزار آٹھ سو چالیس سے 2400 دو ہزار چار سو (ق م)

۱۴۔ چودہواں خاندان 2400 دو ہزار چار سو سے 2300 دو ہزار تین سو (ق م)

۱۵۔ پندرہواں خاندان 2200 دو ہزار دو سو سے 2000 دو ہزار (ق م)

۱۶۔ سولہواں خاندان 2000 دو ہزار سے 1750 سترہ سو

پچاس (ق م)

۱۷۔ سترہواں خاندان 1750 سترہ سو پچاس سے 1600 ایک ہزار چھ سو (ق م)

۱۸۔ اٹھارہواں خاندان 1600 ایک ہزار چھ سو سے 1368 تیرہ سو اڑسٹھ (ق م)

۱۹۔ انیسواں خاندان 1368 تیرہ سو اڑسٹھ سے 1220 بارہ سو بیس (ق م)

۲۰۔ بیسواں خاندان 1368 تیرہ سو اڑسٹھ سے 1220 بارہ سو بیس (ق م)

۲۱۔ اکیسواں خاندان 1220 بارہ سو بیس سے 1800 ایک ہزار آٹھ سو (ق م)

۲۲۔ بائیسواں خاندان 1800 ایک ہزار آٹھ سو سے 950 نو سو پچاس (ق م)

۲۳۔ تئیسواں خاندان 800 آٹھ سو سے 721 سات سو اکیس (ق م)

۲۴۔ چوبیسواں خاندان 721 سات سو اکیس سے 715 سات سو پندرہ (ق م)

۲۵۔ پچیسواں خاندان 715 سات سو پندرہ سے 666 چھ سو چھیاسٹھ (ق م)

۲۶۔ چھبیسواں خاندان 666 چھ سو چھیاسٹھ سے 525 پانچ سو پچیس (ق م)

۲۷۔ ستائیسواں خاندان 525 پانچ سو پچیس سے 408 چار سو آٹھ (ق م)

۲۸۔ اٹھائیسواں خاندان 408 چار سو آٹھ سے 399 تین سو ننانوے (ق م)

۲۹۔ انتیسواں خاندان 399 تین سو ننانوے سے 378 تین سو اٹھتر (ق م)

۳۰۔ تیسواں خاندان 378 تین سو اٹھتر سے 340 تین سو چالیس (ق م)

یہ کتاب 1941 میں تصنیف کی گئی تھی اور اکتوبر 1947 میں شائع ہوئی تھی۔ کتاب کی تاریخی اہمیت کو دیکھتے ہوئے نجمہ رشید ایڈوکیٹ ہائی کورٹ لاہور نے 2004 میں اپنا پیش لفظ لکھ کر شائع کیا۔ پیش لفظ میں درج ہے۔

''اس کتاب میں خواجہ صاحب نے نہایت باریک بینی اور دقتِ نظر کے ساتھ مصری تہذیب و تمدن کا دل آویز مرقع ہماری نگاہوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ فراعنہ کی جلالت شان، ان کے نظم ونسق، ان کے قوانین، ان کے عدل وانصاف، ان کی لڑائیوں اور فتوحات، ان کی شادی بیاہ کی رسومات اور ان کی توہم پرستی کو انتہائی خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اپنی اس تحقیقی کاوش میں انھوں نے مصری تہذیب کو دنیا کی قدیم ترین تہذیب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ خواجہ صاحب نے مصری تہذیب و تمدن کے رسم رواج، تعلیمی صورت حال، دولت، وہاں کے پیشوں، صنعتوں، زیورات کے استعمال، ممی بنانا، اہرام ومقبرے بنانے کی غرض وغایت، وہاں کے رقص وسرور، شراب کے استعمال، ناچ گانے، آرٹ، فنون لطیفہ، موسیقی اور دیگر اہم ثقافتی مظاہر کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے گویا مصری تہذیب منقش ہوکر اس کتاب کے صفحات پر جلوہ گر ہوگئی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ وہ آج بھی مغل شہزادے شہزادیوں اور حور وغلماں کے جھرمٹ میں بیٹھے جہاں ایک طرف بنت بہادر شاہ، بھکاری اور یتیم شہزادے کی بپتا سنا رہے ہوں گے وہیں، دوسری طرف بابری مسجد اور گجرات کی تاریخ بھی رقم کررہے ہوں گے اور محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے شاباش، حضرت امیر خسروؒ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلویؒ اور اجکمار ہردیوؒ سے داد وصول کررہے ہوں گے۔

☆☆☆

’’ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے‘‘

جناب ڈاکٹر محمد تعظیم

برصغیر کی معاشرتی و سیاسی تاریخ میں تصوف کے تمام سلسلوں میں سب سے زیادہ شہرت چشتیہ سلسلے کو نصیب ہوئی۔ کیونکہ اس سلسلے میں موسیقی اور سماع کا رواج، ادبیت اور شعرو شاعری سے انس، ملائمت، غیر مسلموں کے ساتھ غیر معمولی رواداری وغیرہ ایسی خصوصیات تھیں جو ہندوستان کی تمدنی و معاشرتی زندگی سے ہم آہنگ تھیں اور یہی خصوصیات چشتیہ سلسلے کی مقبولیت و اشاعت میں بڑی حد تک معاون و سازگار ثابت ہوئیں۔ چشتی بزرگان اولیاء نے ان خصوصیات کی بنیاد پر نہ صرف ہندوستانیوں بلکہ مسلمانوں کی روحانی تربیت میں بھی انتہائی اہم کردار ادا کیا۔

شیخ المشائخ، سلطان جی، محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ایک سالک کو توبہ، استقامت توبہ، ایمان، استغراق، نماز، تلاوت قرآن، اوراد و وظائف، فقر و فاقہ، ترک دنیا، جہد و طاعت، مشغولی حق، مجاہدہ، صبر و رضا، توکل، احترام پیر، حلم و بُردباری اور جود و سخا وغیرہ کی تعلیمات پر محمول ہیں۔ اس لیے ملفوظات میں ذوق و کیف اور استغراق و تحیر کے ساتھ نماز، روزہ، سنن و نوافل، تلاوت قرآن پاک، تراویح، احترام شریعت اور اتباع سنت کی جابجا تاکیدیں کی گئیں ہیں، خصوصاً نماز باجماعت کی بڑی تاکید فرماتے تھے۔ اس لیے اپنی مجالس میں احکام الٰہی کی تلقین زیادہ تر کلام الٰہی کی تفسیر کے تحت اور احادیث نبوی کے تحت فرماتے تھے۔ ایک موقع پر فرمایا ’’وہ ملک کیوں کر آباد رہے گا جس میں لوگوں کی رائے کو احادیث نبوی پر ترجیح دی جاتی ہو۔‘‘ (سیر الاولیاء، ص:۸۰۶)

ہندوستان کی تاریخ میں اعلیٰ اخلاقی و انسانی قدروں کو پروان چڑھانے نیز رواداری و یکجہتی کی راہ ہموار کرنے میں صوفیاء کا حصہ تاریخ ہندوستان کا ایک ناقابل فراموش باب ہے، جنھوں نے ایک طرف شریعت و طریقت کی آبیاری کی تو دوسری طرف ہندوستان کی تہذیب و تمدن کی ساخت کے تخلیقی عمل میں بھی ایک اہم و مثالی کردار ادا کیا۔

ہندو مذہب کی طرف مشائخ چشت کا جو رویہ تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے جب ایک روز صبح کے وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے مرید خاص حضرت امیر خسروؒ کے ساتھ اپنے جماعت خانہ کی چھت پر چہل قدمی فرمارہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ پڑوس کے کچھ ہندو حضرت بتوں کی پوجا کر رہے ہیں۔ شیخ المشائخ نے انھیں دیکھ دفعتاً فرمایا۔

’’ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے‘‘

امیر خسروؔ نے برجستہ مصرعہ ثانی کہا۔

’’من قبلہ راست کردم جانب کج کلاہے‘‘

کہتے ہیں کہ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاء کے سر پر ٹوپی ٹیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ (تاریخ مشائخ چشت، ۲۹۸)، واقعتاً تیرہویں صدی کی ابتداء میں جب کہ ہندوستان میں مسلم حکومت کی اساس کو نصف صدی سے کچھ زائد عرصہ ہی گزرا تھا، کے تناظر میں شیخ المشائخ کا یہ جملہ نہ صرف بڑی معنویت و افادیت اور دور رس نتائج کا حامل تھا بلکہ حکمراں جماعت کو بھی بالواسطہ بقائے باہم

کے اصول کے ساتھ حکومت کرنے کا درس دے رہا تھا۔ کیونکہ آنے والی صدیوں نے اس جملے کے اثرات وثمرات کا بھرپور مشاہدہ کیا، ساتھ ہی یہ مصرعہ سلطان المشائخ کے افکار کا مکمل ترجمان اور چشتیہ سلسلے کے اصولوں کا نہ صرف بہترین آئینہ دار بھی ہے بلکہ مشائخ چشت کی رواداری اور وسعت نظر کا غماز بھی ہے کہ انھیں اگر ہندوؤں کی کوئی بات پسند آئی تو اس کا بے تکلف اظہار بھی کردیتے۔ حضرتِ نظام الدین اولیاء فرماتے تھے کہ ''قیامت کے بازار میں کسی سودے کی اتنی قیمت اور چلن نہ ہوگا جتنا دل کا خیال رکھنے اور دل خوش کرنے کا۔'' (سیر الاولیاء، ۱۲۰)

دوسری طرف ہندوستان میں علماء کے درمیان بحث کا موضوع ''دار الحرب'' اور ''دار السلام'' میں ہندوؤں کو کس درجہ کا شہری تصور کیا جائے، بنا رہا۔ ان کے برخلاف صوفیاء نے ہندوستان کو ''دار الامن'' مانتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کو انتشار وتصادم کے تناظر میں نہ دیکھ کر دونوں قوتوں کو استحکام کی علامت جانا، دراصل صوفیاء نے اسلام کے ''لکم دینکم ولی دین'' کے واضح اعلان کے بعد اپنے کردار سے اسلام کی وہ تصویر وتعبیر پیش کی جو اسلام کی روح کے عین مطابق تھی کیونکہ خدا کی صفت ''رحمت للعالمین'' ہے اور رسول خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ نے ''رحمت للعالمین'' بنا کر مبعوث فرمایا تھا نہ کہ ''رحمت للمسلمین''۔ لہٰذا صوفیاء نے ''الخلق عیال اللہ'' کے عالمی تصور کے ساتھ اور ہر طرح کے تعصب سے اپنے آپ کو دور رکھ کر معاشرہ میں یکجہتی اور رواداری کا کام انجام دیا، کیونکہ مبلغین اسلام اور روحانیت کے میدان کے پیشواؤں کی حیثیت سے یہ صوفی سب سے پہلے ہندو عوام کے ربط میں آئے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر خواجہ معین الدین چشتی سے عقیدت رکھتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کی ایک موقع پر ایک ہندو جوگی سے ملاقات ہوئی تو آپ نے اس جوگی سے سوال کیا کہ ''اصل کار تمھارے درمیان کون سا ہے؟'' اس نے جواب دیا کہ ''ہماری کتابوں میں یہ مرقوم ہے کہ آدمی کے نفس میں دو عالم ہیں، ایک سفلی اور دوسرا علوی۔ عالم علوی سر سے ناف تک اور عالم سفلی ناف سے قدم تک۔ عالم علوی میں جملہ صدق وصفا ونیک اخلاق وحسن کا معاملہ ہے اور عالم سفلی میں کل نگہداشت پاکی و پارسائی کا ذکر ہے۔'' سلطان المشائخ نے کہا کہ ''مجھے اس کی بات بہت اچھی معلوم ہوئی۔'' (ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر از محمد عمر ص: ۲۸۵، فوائد الفواد، ص: ۸۵)۔

شیخ نظام الدین اولیاء کے اس قول کے تناظر میں واقعہ یہ ہے کہ ہندو مسلم اختلاط کا عمل قیام سلطنت سے ہی شروع ہوگیا تھا جس میں صوفیاء اور ان کی خانقاہوں نے اہم کردار ادا کیا کیونکہ ان کی خانقاہوں کے دروازے بلا لحاظ رنگ ونسل، مذہب و مسلک ہر ایک کے لیے کھلے تھے۔ حسن سجزی فوائد الفواد میں لکھتے ہیں کہ شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں ہندو جوگی آتے تھے اور بے باکی کے ساتھ شیخ سے مذاکرے کیا کرتے تھے۔ (فواء الفواد، ص: ۱۶۶)۔ فوائد الفواد میں ہی مرقوم ہے کہ بابا فرید کی خانقاہ میں ہندو جوگی مستقل آتے رہتے تھے ایک دفعہ حضرت نظام الدین اولیاء نے بھی ایک ہندو جوگی سے جو ماہر علم نجوم بھی تھا اپنے مستقبل کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی (فواء الفواد، ص: ۴۱۷)۔ صوفیاء اور جوگیوں کے درمیان مذاکرے عام سی بات ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں بہت سے شہر صوفیاء ودانشوروں اور علماء کے مرکز بن گئے تھے جہاں مشترکہ اقدار جنم لے رہی تھیں۔ دہلی میں یہ بحث ہو رہی تھی کہ کافر اور کبیرہ گناہ کرنے والے (یکساں) ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے یا نہیں جو ایک معتزلی نظریہ ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء اس کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اشعریہ مذہب میں آیا ہے کہ جو کافر اپنے خاتمے کے وقت ایمان پر ہو، اس کا حال مومنوں کا سا رہے گا اور

وہ مومن جس کا خاتمہ بخدا کفر پر ہو اس کا حال کافر کا حال ہے۔ اس سلسلے میں مزید کہا کہ ''خواجہ حمید الدین سوالی نے ناگور میں ایک ہندو کے متعلق بار بار یہ بات کہی کہ یہ خدا کا ولی ہے'' (فوائد الفواد، ص:۱۱۸) ظاہر ہے یہ سوچ اس بات کی غماز تھی کہ ان صوفیاء نے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو انتشار اور تصادم کے تناظر میں نہیں دیکھا بلکہ صوفیاء کو علم تھا کہ ہندو قوم ایک خدا پر یقین و تصور رکھتی ہے اور اس یقین و تصور نے ہی ہندو جوگیوں اور مسلم صوفیاء کو قربت بخشی تھی اور نتیجے کے طور پر گرونانک اور کبیر جیسی شخصیات سامنے آئیں۔ اور ان سب سے مل کر معاشرے میں موجود خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی اور پھر حالت یہ ہوگئی تھی کہ بقول ملا عبدالقادر بدایونی ''ایک ہندو برہمن مسلمانوں کو اسلامی علوم کا درس دیتا تھا'' (منتخب التواریخ جلد اول، ص:۳۲۳)۔ ایک مجلس میں حاضرین میں سے ایک نے حضرت شیخ المشائخ سے پوچھا کہ ''ایک ہندو کلمہ پڑھتا ہے اور خدا کی وحدانیت اور رسولوں کی رسالت کا قائل ہے، لیکن جوں ہی مسلمان آتے ہیں، خاموش ہو جاتا ہے، اس کی عاقبت کیسی ہوگی؟ حضرت نظام الدین اولیاء نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ اس کے بارے میں جو بھی فیصلہ فرمائے، چاہے تو معاف کردے چاہے عذاب دے'' (فوائد الفواد، ص:۲۳۲)۔ مشائخ چشت ہدایت فرماتے تھے کہ اگر کوئی ہندو تمھاری محبت میں گرویدگی یا عقیدت کی بنا پر تمھارے پاس آنے جانے لگے اور تم سے ذکر وغیرہ کے متعلق معلوم کرے تو فوراً بتادو تم اس فکر میں نہ رہو کہ وہ باقاعدہ مسلمان ہو جائے، تب ہی اسے روحانی تعلیم دی جائے گی۔ حضرت شیخ المشائخ کا ایقان تھا کہ کسی کو نہ تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جاسکتا ہے نہ زبانی تلقین سے۔ اچھا کردار، تلوار اور زبان سے زیادہ موثر ہوتا ہے، اس کی مقناطیسی قوت، اعتقاد و یقین و عمل میں انقلاب برپا کرسکتی ہے۔ دوسروں کو مسلمان بنانے سے پہلے خود مسلمان بننا ضروری ہے پھر تمھاری صحبت میں جو آئے گا خود مسلمان ہو جائے گا (تاریخ مشائخ چشت، ص:۳۰۱)۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ ''چشتی خانقاہوں نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں بالواسطہ اور بلاواسطہ گردوپیش کی غیر مسلم آبادیوں کو اپنے اخلاق، روحانیت اور مساوات و اخوت سے جس کی فضا ان خانقاہوں میں قائم تھی ضرور متاثر کیا۔ اور ان قوموں کو جو کشف و کرامت اور روحانیت سے خاص طور پر متاثر ہوتی ہیں، اسلام میں داخل کرنے کا ذریعہ بنے۔'' (تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم، ص:۱۶۹)۔ حضرت شیخ المشائخ کا قول ہے ''قفل سعادت کی متعدد کنجیاں ہیں واسطہ ہر کنجی سے رکھنا چاہیے۔ کیا معلوم کون سی کنجی کام کر جائے، اور ایک سے کام نہ ہو تو دوسری سے۔ اس سے نہ کھلے تو کسی اور سے۔'' (صاحب جی سلطان جی از ڈاکٹر اسلم فرخی، ص:۷)۔

حضرت نظام الدین اولیاء کے ان ہی افکار کا نتیجہ تھا کہ پندرہویں صدی کے صابریہ سلسلے کے ایک بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی لکھتے ہیں ''یہ کیسا شور اور غوغا پھیلا دیا گیا ہے کہ کوئی مومن ہے کوئی کافر، کوئی مطیع ہے، کوئی گنہگار، کوئی صحیح راہ پر اور کوئی بے راہ، کوئی مسلم، کوئی پارسا، کوئی ملحد، کوئی ترسا (سچ تو یہ ہے کہ) سب ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں'' (مکتوبات شیخ عبدالقدوس گنگوہی، ص:۲۰۵، منقول از سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۶۶۹)۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے مرید خاص حضرت امیر خسروؒ سے ہندوی زبان میں بھی شعر کہنے کی تلقین کی تاکہ مسلمان ہندوؤں کی عام بول چال کی طرف راغب ہوں اور اجنبیت و دوری کا احساس مٹ جائے (نظامی بنسری از خواجہ حسن نظامی، ص:۳۰)۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کو شیخ نظام الدین اولیاء نے مشورہ دیا تھا کہ وہ شہروں میں رہ کر عوام کے درمیان زندگی بسر کریں اور ان ہی میں رہ کر روحانی زندگی

گزاریں (ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص: ۲۸۷)۔ صوفی حمید الدین سوالی ناگوری اپنے گھر میں اور ہندو حضرات سے جوان سے ملاقات کے لیے آتے تھے ہندوی زبان میں ہی گفتگو کیا کرتے تھے۔ (سرور الصدور، ص: ۸۳۵)۔ حضرت بندہ نواز گیسو دراز سنسکرت زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ حضرت گیسو دراز ہندوؤں کی کسی بھی قیمت پر تذلیل برداشت نہ کرتے تھے۔ (جوامع الکلم، ص: ۲، ۱۷، ۱۱۹)۔ ان درویشوں کی مجالس میں بتخانوں کا تذکرہ احترام سے کیا جاتا تھا اور بت خانوں میں صوفیاء کرام کا نام عزت سے لیا جاتا تھا (درر نظامی از مولانا محمود بن جاندار، ص: ۱۶۱)۔ یہ صوفیاء قرآن کریم کی ان آیت کریمہ ''وان من أمة الا خلا فیها نذیر'' (اور ہر امت میں کوئی نہ کوئی خود خدا ولانے والا ہوا ہے۔ (سورہ فاطر: ۲۴)، مزید ''ولکل أمة رسول'' (اور ہر امت میں ایک رسول ہوا ہے۔ (سورہ یونس: ۴۷) نیز ''منهم من قصصنا علیک، ومنهم من لم نقصص علیک'' (سابقہ رسولوں میں سے کسی کے حالات تم سے بیان کیے اور کسی کے حالات بیان نہیں کیے۔ (سورہ مومن: ۷۸) سے اچھی طرح واقف تھے۔ لہٰذا شیخ رکن الدین گنگوہی ایک جوگی بال ناتھ سے اسرار توحید معلوم کیا کرتے تھے۔ (لطائف قدوسی، ص: ۴۷)، رزق اللہ مشتاقی اور میاں طٰہٰ، دونوں ہندوؤں کے علوم میں ماہر تصور کیے جاتے تھے (واقعات مشتاقی، ص: ۱۳۳)۔ دراصل مشائخ چشت اور صوفیاء کرام کا طرز عمل اور مسلک ''صلح کل'' تھا۔ ہر مذہب و مسلک کے افراد کے لیے ان کی خانقاہوں کے دروازے کھلے تھے اور بلا جھجک گفتگو و مباحثہ کر سکتے تھے۔ ان صوفیاء نے دونوں قوموں کے درمیان رابطہ کا کام انجام دیا جہاں دونوں کے درمیان مکالمہ جاری تھا اور ایک مشترکہ تہذیب کا آمیزہ تیار ہو رہا تھا۔ اسی لیے ان کی خانقاہوں میں میٹھے چاول و کھچڑا پکایا جاتا تھا تاکہ لوگ بلا امتیاز مذہب و مسلک اور نظام مراتب کھا سکیں۔

شیخ نظام الدین اولیاء کے مندرجہ بالا جملے کی معنویت و افادیت آگے چل کر مختلف مسالک کے نظریات میں اور زیادہ واضح طور پر نظر آتی ہے جب شہزادہ دارا شکوہ و جہان آراء کے زیر اثر قادریہ سلسلے میں اور زیادہ روادارانہ طرز عمل اپنایا گیا۔ اٹھارہویں صدی کے نقشبندی صوفی و شاعر مرزا مظہر جان جاناں نے وسیع المشربی اور رواداری کا ایسا ہی طرز عمل اختیار کیا تھا جو بعینہٖ دارا شکوہ سے مشابہت رکھتا تھا۔ انھوں نے ویدوں کو الہامی کتاب بتایا اور کہا کہ اہل کتاب کی طرح رسول اور نبی مبعوث ہوئے تھے اور ہندو لوگ بھی توحید پرست ہیں اور اس طرح مرزا مظہر نے انھیں بت پرستی کے الزام سے بری کر دیا اور ان کی بت پرستی کو تصور شیخ کے مماثل قرار دیا۔ (کلمات طیبات وآگرہ ۱۹۱۴، ص: ۴۰-۳۷، مقامات مظہری، ص: ۶۹۹)۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے اور جانشین شاہ عبدالعزیز کرشن بھگوان کو اولیاء میں شمار کرتے تھے۔ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ حضور کرشن جی کے حق میں کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ بہتر تو یہ ہے کہ ان کے حق میں خاموشی سے کام لیا جائے لیکن بھگوت گیتا سے جو ہندوؤں کی ایک مقدس کتاب ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرشن جی اولیاء میں سے تھے'' (ملفوظات شاہ عبدالعزیز مرتبہ قاضی بشیر الدین میرٹھی، مطبع مجتبائی میرٹھ ۱۳۱۴ھ، اور کوثر، ص: ۵۶۹، ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص: ۲۹۰)۔ ایک دفعہ شیخ المشائخ نے ارشاد فرمایا ''اگر کوئی کانٹا رکھے اور تم بھی کانٹا رکھ دو تو کانٹے ہی کانٹے جمع ہو جائیں گے۔ لوگوں کے درمیان عام اصول یہی ہے کہ سیدھوں کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھوں کے ساتھ ٹیڑھا۔ لیکن درویشوں کا اصول یہ ہے کہ سیدھوں کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھوں کے ساتھ بھی سیدھا'' طریقہ اپنایا جائے (فوائد الفواد، ص: ۹۵)۔ شیخ المشائخ کا یہ قول

بقائے باہم، یکجہتی ورواداری کا بہترین غماز ہے۔

درحقیقت علماء اسلام کا تعلق قرآن وحدیث، منطق وفلسفہ اورشریعت وفقہ کی تعلیم وترویج اوراشاعت کے ساتھ زیادہ ہونے کے سبب صرف مسلم معاشرے کے ساتھ ہی سابقہ پڑتا تھا۔ وہ عام اہل ہند سے رابطہ نہ رکھتے تھے۔ لیکن صوفیاء چونکہ مبلغین اسلام تھے نیز انھیں کسی کی تکفیر وتفسیق سے کوئی تعلق نہ تھا اس لیے کسی کو بُرا نہ کہتے بلکہ سب اہل عالم کو بلا امتیاز مذہب وملت 'خدا کا کنبہ' سمجھتے تھے اور باہم اختلافات کو بڑھاوا دینے کی بجائے مشترک مالوفات کی تلاش میں رہتے۔ سب کو عرفان الٰہی کی تعلیم دینے کے واسطے ان کے دروازے ہر کس وناکس کے لیے کھلے تھے۔ ان کے یہاں اونچ نیچ وچھوا چھوت کے لیے کوئی امتیاز نہ تھا۔ وہ امن وآشتی اور مساوات انسانی کی تلقین کرکے اسلام کے اساسی اصولوں کو تقویت پہنچارہے تھے۔ ان ہی مقدس زندگیوں کے اثر سے عوام کو اسلام کی طرف کشش ورغبت پیدا ہوئی چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت زیادہ تر ان صوفیاء ہی کی مساعی وکوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان صوفیاء کو ذاتی اغراض سے کوئی سروکار نہ تھا اس لیے عموماً امراء وملوک بھی ان کی عزت وتوقیر کرتے تھے۔ اوران کے لنگروں کے مصارف کے لیے اکثر روپیہ پیسہ دیتے تھے (مسلم ثقافت ہندوستان میں از عبدالمجید سالک، ص: ۲۳۶)۔

امراء وملوک کو بھی اپنی سلطنت کو پائیدار اور مستحکم بنانے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت تھی اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب یہ دونوں قومیں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اس کے لیے سماجی وسیاسی سطح پر اختلاط ضروری تھا۔ اور یہ کام صوفیاء، خاص طور پر چشتی صوفیاء نے بالواسطہ طور پر بخوبی انجام دیا اور انتشار کی ان قوتوں کو امن واستحکام کی قوتوں میں تبدیل کردیا۔ لہٰذا امراء وملوک کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان کی خانقاہوں کا نہ صرف احترام کریں بلکہ ان کی خانقاہوں کے لنگر خانوں کے مصارف میں معاون بھی بنیں۔ اس لیے ان امراء وملوک نے ان کی خانقاہوں کو تحائف ورقوم عطا کیں۔ آگے چل کر مغل عہد میں رواداری، بقائے باہم اور سیاسی وسماجی ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے مغل بادشاہوں نے ان خانقاہوں کے مصارف کے لیے باقاعدہ آج کی غیر سرکاری تنظیموں کی طرح جو فلاحی ورفاہی کام انجام دیتی ہیں، بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں، اوران خانقاہوں کو ایک ثقافتی ورفاہی مرکز کے طور پر بڑھاوا دیا۔ ان چشتی صوفیاء نے نہ صرف اپنی زندگی میں بلکہ بعد میں ان کی خانقاہوں نے بھی یکجہتی، رواداری اور ہم آہنگی وبقائے باہم کے لیے ایک اہم ادارے کے طور پر کام کیا اور آج تک کررہی ہیں اور شیخ المشائخ کے اس جملے "ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے" کی معنویت وافادیت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

(صفحہ ۳۲ کا بقیہ)

پیش کردیا جو ایک انگریز افسر نے دوسرے انگریز افسر کو اس خاتون کے متعلق شکایت کرتے ہوئے لکھا تھا۔ خواجہ حسن نظامیؒ نے ایک انصاف پسند محقق کا فرض انجام دیتے ہوئے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ غدر کے خاتمے کے بعد بہادر شاہ ظفر کو سزائے موت سے بچا کر صرف جلا وطنی کی سزا تجویز کرانے میں سر جان لارنس کا بڑا دخل رہا ہے۔ خواجہ صاحب نے سر جان لارنس اور ان کے عادلانہ رویے کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا ہے کہ غدر کی ناکامی کے بعد تمام انگریز افسران دہلی کی جامع مسجد کو گرانے یا گرجا گھر میں تبدیل کرنے کے حامی تھے، لیکن یہی سر جان لارنس تھے جنھوں نے اپنوں کی جانب سے سخت دباؤ اور ناراضی کو جھیلتے ہوئے جامع مسجد کی حفاظت کی۔ غرض یہ کہ اسی طرح کی بے شمار تحقیقات اور تاریخی وعلمی نکات خواجہ حسن نظامیؒ کے مضامین اور تصانیف میں بکھرے پڑے ہیں، جن کی روشنی میں ۱۸۵۷ کے متعلق ان کی انفرادیت بھی واضح ہوتی ہے اوران کے تحقیقی رویے کا تعین بھی ہوتا ہے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے متعلق خواجہ حسن نظامیؒ کا تحقیقی رویّہ

جناب اجمل فاروق ندوی

انقلاب ۱۸۵۷ کو ہندوستان کی جنگ آزادی میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک ایسی تحریک تھی، جو بڑے زوروشور کے ساتھ اٹھی اور ناکامی پر منتج ہوئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک سے بہت سی کامیاب تحریکوں نے جنم لیا۔ اس انقلابی تحریک کا مطالعہ کیے بغیر نہ تو مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے اسباب پوری طرح سے سامنے آسکتے ہیں اور نہ علی گڑھ اور دیوبند جیسی عظیم تحریکات کی ابتداء کو سمجھا جاسکتا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ دوقومی نظریہ اور موجودہ ہندوستان میں پائی جانے والی مذہبی فرقہ واریت کا سرا بھی اِسی انقلابی تحریک سے ملتا ہے۔ اِسی لیے تمام مورخین نے اس واقعے کو تاریخ ہند کا ایک فیصلہ کن موڑ (Turning Point) مانا ہے۔ اس تاریخی واقعے پر مورخین نے اپنے اپنے انداز سے بے شمار کتابیں لکھی ہیں اور آج بھی اس موضوع پر مستقل لکھا جارہا ہے۔ لیکن مصورفطرت حضرت خواجہ حسن نظامی (۲۵ر دسمبر ۱۸۷۸۔ ۳۱ر جولائی 1955) نے اس کے متعلق جو کچھ اور جس انداز سے لکھا، اُسے علم وتاریخ کی دنیا میں ایک منفرد اور امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

خواجہ حسن نظامیؒ کو ۱۸۵۷ کے خونیں انقلاب سے بہت دل چسپی تھی۔ انھوں نے اس موضوع پر ۱۲ کتابیں لکھیں۔ ان میں سے بعض کا اپنی نگرانی میں ترجمہ بھی کراکر شائع کرایا۔ خواجہ صاحب نے اپنی ذاتی تحقیق سے ایسے شہزادوں اور شہزادیوں کے حالات معلوم کیے جو غدر کے بعد انتہائی کسمپرسی کے حالات گزارنے پر مجبور ہوئے۔ خواجہ صاحب نے اُن دردناک واقعات کو افسانوی انداز میں دہلی کی کلاسیکی زبان میں ڈھال کر ''بیگمات کے آنسو'' کے نام سے شائع کرایا، تاکہ عوام وخواص یکساں طور پر اس حادثے سے آگاہی حاصل کرسکیں۔ انھوں نے ''بیگمات کے آنسو'' کے فوراً بعد مستند مآخذ سے استفادہ کرکے اور گھر گھر جاکر اپنی ذاتی تحقیقات کے ذریعہ ایسے واقعات بھی جمع کیے، جن میں انگریزوں کے ساتھ بعض ہندوستانیوں کی طرف سے غیر عادلانہ رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ واقعات کے اس مجموعے کو خواجہ صاحب نے ''انگریزوں کی بپتا'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک بڑا منفرد اور اہم کام یہ بھی کیا کہ خطوطِ غالب میں موجود ۱۸۵۷ کے متعلق تمام معلومات کو نکال کر یک جا کردیا اور ایک لفظ کا اضافہ کیے بغیر اسی کو روزنامچے کی شکل دے کر ''غالب کا روزنامچہ غدر ۱۸۵۷'' نام سے مستقل کتاب تالیف کی اور اُسے طبع کرایا۔

۱۸۵۷ کے متعلق خواجہ حسن نظامیؒ کی کتابوں کے مجموعی مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ خواجہ صاحب کو اس واقعے سے تین وجوہ کی بناء پر بہت زیادہ دل چسپی تھی۔ پہلی وجہ یہ کہ وہ دنیاوالوں کو زمانے کے الٹ پھیر سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ لوگ اس واقعے کی روشنی میں اپنی زندگیوں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کس طرح حالات نے کروٹ لی اور ہندوستان کی عظیم سلطنت کے فرماں روا اور سربراہانِ مملکت دانے دانے کے محتاج ہوکر رہ گئے۔ خواجہ صاحب نے اپنی کتاب ''بیگمات کے آنسو'' میں ایک مقام پر اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آج اور کل کے فرق کو سمجھنے میں یورپین اور ایشیائی فلاسفروں کے اقوال پر غور کرنے سے بہت آسانی

ہو جاتی ہے، مگر اس کو صرف دماغ سمجھ سکتا ہے، آنکھ کو مشاہدے کا لطف نہیں آتا۔

۱۴؍اگست ۱۹۱۴ سے جرمنی قوم کا 'آج' پیش نظر تھا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا 'کل' کیا ہوگا۔ مگر ۱۹۱۸ نے بتادیا، دکھادیا اور سمجھا دیا کہ 'کل' کی یہ حالت ہے اور ایسا دکھایا کہ اب فلسفہ کی ضرورت ہی نہ رہی۔ روس کا 'آج' صدیوں سے مشہور تھا۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اس کی آمدِ ہندوستان کا چرچا سنتا تھا اور ایک خوف ناک وحشی اور موذی حریف کی چڑھائی کو آفتِ امن خیال کرتا تھا۔ لیکن 'آج' ختم ہوا اور 'کل' ایسا دیکھنے میں آیا کہ روس کا تاج وتخت ہی اوندھا ہوگیا۔ دہلی میں مغلیہ خاندان کا غلغلہ، اس کی تیغ زنی اور بزم آرائی کے وہ گونا گوں صفات کے سبب گھر گھر شور مچا ہوا تھا اور ہندوستان کا کوئی خطہ ان کی عظمت سے انکار کرنے کی مجال نہ رکھتا تھا۔ مگر جب ان کا 'آج' ختم ہوا تو 'کل' کی حالت کسی سے نہ دیکھی گئی۔"

(بیگمات کے آنسو، ص:۶۰، ۶۱)

اس واقعے سے ان کی غیر معمولی دل چسپی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اس واقعے کو انگریز یا ہندوستانی کی تفریق سے اوپر اٹھ کر انسان اور انسانیت کے لیے تباہ کن تصور کرتے تھے۔ انھیں اس بات کا سخت افسوس تھا کہ ۱۸۵۷ کے انقلاب میں نہ ہندوستانیوں نے انسانیت کا خیال کیا اور نہ انگریزوں نے۔ حضرت خواجہ مرحوم اس حادثے کی روشنی میں انسان کو انسانیت کا درس دینا چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ انسان کو کسی بھی حال میں انسانیت کے اشرف واعلیٰ مقام سے نیچے نہ گرنا چاہیے۔ چناں چہ "انگریزوں کی بپتا" کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں:

"میں نے اس تاریخی کتاب کے پہلے حصے "بیگمات کے آنسو" نامی کتاب میں ہندوستانی عورتوں اور مردوں کی مصیبتوں کے حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں اور پڑھنے والے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ۱۸۵۷ میں باغیوں نے بھی بہت ظلم کیے تھے، مگر انگریزوں نے بھی کچھ کم ظلم نہیں کیے تھے۔ انسان کا وحشیانہ پن دونوں میں نظر آتا ہے۔ البتہ یہ بات بھی ان قصوں سے ظاہر ہوتی ہے کہ ہر انگریز عورت مرد کو ہر مقام پر رحم دل ہندوستانی بہت زیادہ میسر آتے رہے۔ خاص کر مسلمان فقیر اور ہندو سادھو ہر جگہ رحم دل ثابت ہوئے۔ لیکن جب انگریزوں کو غلبہ حاصل ہوا تو ان کی قوم میں ایسے بہت کم آدمی تھے جنھوں نے بے گناہوں پر ترس کھایا ہو۔"

پھر اس تمہید کا اختتام اس پیغام کے ساتھ کیا ہے:

"بہ ہر حال وقت آگیا ہے کہ اب ہم سب انسان آپس میں ایک دوسرے کو کسی ایذا دینے کا خیال بھی دلوں میں نہ آنے دیں۔" (انگریزوں کی بپتا، ص:۱، ۲)

وہ تیسری وجہ جس کی بناء پر خواجہ صاحب کو اس واقعے سے دل چسپی تھی وہ یہ ہے کہ وہ اس حادثۂ عظیم کی تباہ کاریوں کو نوجوانوں کے لیے آئینے کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے تاکہ نئی نسل اس واقعے سے یہ بڑا سبق حاصل کر سکے کہ بے جا جذبات اور اشتعال کے نتیجے میں کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب "دہلی کی جاں کنی" کا مقصدِ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اِس کتاب کی تالیف کا مقصد صرف یہی ہے کہ قوم وملک کی آئندہ موجودہ نسلوں کو اپنے پایۂ تخت کے تاریخی انقلابات سے آگاہی ہو۔ نیز وہ یہ بھی دیکھ لیں کہ لڑائی جھگڑے میں کیسے کیسے مصائب و ہولناک تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج کل کے زمانے میں بعض ناتجربہ کار جوشیلے نوجوان لڑائی وخوں ریزی کے خواب دیکھا

کرتے ہیں، اُن کو یہ کتاب اچھی طرح بیدار کردے گی کہ بے امنی کے نتائج ایسے ہوتے ہیں۔"

(دہلی کی جاں کنی، ص: ۱۰۲)

خواجہ صاحب نے اپنی اِس کتاب "دہلی کی جاں کنی" کے خاتمے پر جو نتیجہ اخذ کیا ہے اُسے اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"اِن تمام حالات پر مؤرخانہ و دوراندیشانہ غور کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ امن بہت بڑی دولت ہے اور بے امنی میں بڑی سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج جو لوگ انگریزوں کو اس ملک سے بزورِ قوت نکال دینا چاہتے ہیں، ان کو ذرا تخلیے میں بیٹھ کر یہ کتاب پڑھ لینی چاہیے۔ اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ جذبات عارضی سے مشتعل ہوجانا اور آنکھیں بند کرکے کوئی کام کر بیٹھنا، بے گناہوں پر کیسی کیسی تباہیاں لاتا ہے۔"

(دہلی کی جاں کنی، ص: ۵۴)

خواجہ حسن نظامیؒ دِلّی والے تھے۔ انھیں دلّی کی تہذیب و ثقافت بہت عزیز تھی۔ اُن کی تحریروں میں ہمیں دلّی کی کلاسیکل زبان بھی ملتی ہے اور یہاں کی تہذیب کا رنگ ڈھنگ بھی واضح طور پر ملتا ہے۔ اُن کی اِسی خوبی سے متاثر ہوکر اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

حضرت ابوہریرہ سے بلّی نہ چھٹ سکی
خواجہ حسن نظامی سے دلّی نہ چھٹ سکی

دلّی سے اُن کے اِس قلبی لگاؤ ہی کا نتیجہ ہے کہ ۱۸۵۷ سے متعلق ان کی گیارہ کتابوں پر مشتمل مجموعہ تصانیف میں جابجا دلّی اور دلّی والوں کے بارے میں نادر تحقیقات ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر خواجہ صاحب نے انگریزوں سے دلّی کی ناراضی کی وجوہ بیان کی ہیں جب کہ عام طور پر مؤرخین پورے ہندوستان کی انگریزوں سے ناراضی کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ سرسید احمد خاں نے ایک مستقل کتاب "اسباب بغاوت ہند" تصنیف کردی۔ لیکن اس میں خاص دلّی کی ناراضی کی وجوہ کی وضاحت نہیں ملتی۔

خواجہ حسن نظامیؒ نے اپنی ایک اہم کتاب "دہلی کی جاں کنی" میں سات صفحات پر مشتمل خالص علمی و تحقیقی بحث کے ذریعہ دلّی کی انگریزوں سے ناراضی کی چار وجوہ بیان کی ہیں۔ ان کی رائے میں دلّی کی ناراضی کی پہلی وجہ ۱۸۰۴ میں پیش کی گئی وہ ایک تجویز تھی، جس میں اُس وقت کے حاکم ہند شاہ عالم اور اُن کے خاندان کو دہلی کے لال قلعے سے نکال کر بہار کے صوبہ مونگیر میں قیام پذیر کرنے کی بات کہی گئی تھی۔ شاہ عالم کے سخت رویے کی وجہ سے یہ تجویز اگرچہ کارآمد تو نہیں ہوسکی لیکن دلّی والوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف بیج ضرور بو گئی۔ خواجہ صاحب کی رائے میں انگریزوں سے دلّی کی ناراضی کی دوسری وجہ ۱۸۰۶ میں اکبر شاہ کے دورِ سلطنت میں اُس وقت کے نوجوان ریزیڈینٹ آف ڈیلہی مسٹر چارلس مٹکاف کی وہ ناشائستہ و نازیبا حرکتیں بنیں، جو انھوں نے بادشاہ، اس کے خاندان، دوسرے امراء اور مذہبی پیشواؤں کے ساتھ روا رکھیں۔ اسی طرح تیسری وجہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں اُس وقت پیدا ہوئی، جب انھوں نے اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد برٹش گورنمنٹ کے سامنے اپنے باپ اکبر شاہ سے کیے گئے وعدوں کے مطابق وظیفہ بڑھانے کا مطالبہ رکھا اور انگریزوں نے اُس مطالبے کو کئی شرائط کے گھیرے میں لاکر نامنظور کردیا۔ خواجہ صاحب کی نظر میں انگریزوں سے دلّی کی ناراضی کی چوتھی اور آخری وجہ بہادر شاہ ظفر کی ولی عہدی کے جھگڑے کے وقت سامنے آئی۔ خواجہؒ مرحوم نے اس جھگڑے کو بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔

اس پوری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ انگریزوں نے بہادر شاہ

ظفر کے سب سے بڑے بیٹے مرزا قویش کو پورے شاہی خاندان کی مخالفت پر آمادہ کرلیا اور جواں بخت کی ولی عہدی کے مقابلے میں اپنے آپ کو ولی عہدی کا مستحق قرار دلوادیا۔ اس پر غضب یہ کہ بادشاہ کے لقب کے خاتمے، لال قلعے کو خالی کرنے اور ماہانہ وظیفہ ایک لاکھ سے صرف ۱۵ ہزار کردینے پر بھی مرزا قویش کو راضی کرلیا۔ اِس چوتھی وجہ کو بیان کرنے کے بعد خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

''جس وقت مرزا قویاش کی ولی عہدی اور ان شرائط کا علم بادشاہ اور ان کے خاندان کو ہوا تو ان کے دلوں میں غصے کی آگ بھڑک اٹھی اور دہلی کے ہر باشندے کو اس خبر سے ملال ہوا اور لوگوں نے یقین کرلیا کہ برٹش گورنمنٹ رفتہ رفتہ جس طرح ہمارے بادشاہ کے حقوق کو فنا کررہی ہے، اسی طرح رعایا کے حقوق بھی اس کے ہاں محفوظ نہیں ہیں۔ یہ انتہائی ناراضی کا زمانہ تھا۔ ایک طرف پایۂ تخت میں یہ حالت درپیش تھی اور دوسری طرف تمام ہندوستان میں وہ اسباب بے چینی پیدا کررہے تھے، جن کا ذکر سرسید وغیرہ نے اسباب بغاوت ہند میں کیا ہے۔ مرزا قویاش کی ولی عہدی ۱۸۵۶ میں ہوئی اور ۱۸۵۷ میں غدر ہوگیا۔ گویا جو پھوڑا مدت سے پک رہا تھا وہ ۱۱رمئی ۱۸۵۷ کو آخر کار پھوٹ نکلا۔''

(دہلی کی جاں کنی، ص:۸)

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ ایک صوفی و درویش بھی تھے اور عالم شریعت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تحریروں میں وہ کسی بھی واقعے یا کسی بھی معاملے کی ظاہری وجوہ بھی بیان کرتے ہیں اور اس کے باطنی یا روحانی اسباب پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ کے خونیں انقلاب کے تذکرے میں بھی ہمیں مختلف مقامات پر ان کے اس وصف کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر خواجہ صاحب نے مغل حکومت کے زوال کی باطنی وجہ کا انکشاف کیا ہے۔ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے متعلق یہ بات بھی بیان کی ہے کہ وہ صاحب باطن اور بڑے عارف ہونے کی وجہ سے بذریعہ مکاشفہ غدر کے تمام واقعات معلوم کرچکے تھے، مگر وہ رضائے الٰہی پر شاکر تھے۔ اسی درمیان دہلی میں حضرت شاہ اللہ بخش چشتی سلیمانی تونسویؒ کی آمد ہوئی اور بہادر شاہ ظفر نے اُن کو کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد تخلیے میں بادشاہ نے اُن سے اپنے مکاشفے کی روشنی میں حکومت کی کمزوری کا غیبی سبب دریافت کیا۔ حضرت شاہ اللہ بخش نے جواب دیا کہ تمھارے بزرگوں سے کچھ خطائیں سرزد ہوئی ہیں، جن میں سب سے بڑی خطا یہ ہے کہ عاشق و معشوق کے آگے حجاب ڈالا گیا یعنی حضرت محبوب الٰہیؒ اور حضرت امیر خسروؒ کے مزارات کے بیچ میں بادشاہ محمد شاہ کو دفن کیا گیا۔ ان دونوں بزرگوں کے مابین جو محبت تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ ان دونوں حضرات کے مزارات کے درمیان کوئی حجاب نہ کیا جاتا۔ کیوں کہ حضرت محبوب الٰہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''اگر شریعت کا قدم درمیان نہ ہوتا تو ہم اور خسرو ایک ہی قبر میں رہتے۔'' ایسی صورت میں محمد شاہ کو بیچ میں دفن کرنا بہت برا ہوا اور تباہی سلطنت پر آئی۔ اس تفصیل کو بیان کرنے کے بعد خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

''بہادر شاہ پر اس بیان کا بہت بڑا اثر ہوا اور انھوں نے اس پر دل سے یقین کیا۔ گو ظاہری و باطنی اعتبار سے ان کے نزدیک زوال حکومت کے صدہا اسباب تھے، جن کو وہ بارہا خلوت کی صحبت میں بیان کرتے تھے۔''

(بیگمات کے آنسو، ص:۳)

اسی طرح خواجہ صاحب نے انقلاب ۱۸۵۷ کی ناکامی کی باطنی وجہ کے طور پر اُس غیر عادلانہ رویے کا تذکرہ کیا ہے، جو ہندوستانیوں نے انگریزوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ چناں چہ وہ

بڑی ناراضی کے انداز میں فرماتے ہیں:

''غرض یہ کہ اس فساد میں نہایت سخت وحشیانہ ظلم و ستم کیے گئے۔ بچے رحم مادر سے نکالے گئے۔ ننھے ننھے بچے تلوار اور نیزوں کی نوک پر اٹھا کر بازاروں میں فخریہ پھرائے گئے۔ عورتوں کو برہنہ کرکے نہایت ذلت وخواری سے قتل کیا گیا اور اسی وجہ سے خدا نے فسادیوں کو ذلیل کیا اور انگریزی حکومت پھر قائم ہوگئی۔'' (انگریزوں کی بپتا، ص:۴۶)

اس روحانی و باطنی وجہ ناکامی کے ساتھ ساتھ خواجہ مرحوم نے اس انقلاب کی ناکامی اور انگریزوں کے دوبارہ قبضے کے دو بہت باریک اور تاریخی اسباب بیان کیے ہیں۔ انھوں نے انگریز افسروں کی ہمت اور استقلال کی تعریف کرتے ہوئے اُن کے آپسی رابطے اور نازک ترین حالات میں بھی ایک دوسرے کے مشورے سے فائدہ اٹھاتے رہنے کو اُن کی کامیابی کی پہلی بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔ وہ انگریزی افسروں کے خطوط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ خطوط اس تاریخی نکتے کو بھی ظاہر کرتے ہیں جو انگریزوں کے دوبارہ قبضۂ ہندوستان کا راز ہیں اور وہ صرف یہ ہے کہ تمام ملک کے انگریز باوجود خط وکتابت کی مشکلات کے ایک دوسرے کے مشورے سے فائدہ اٹھاتے اور ایک دوسرے کی مدد حاصل کرتے۔''

(محاصرۂ غدر دہلی کے خطوط، ص:۱،۲)

خواجہ صاحب نے انقلاب کی ناکامی کا تذکرہ کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں لکھا ہے کہ بہادر شاہ اور ان کے بیٹے مرزا مغل میں انقلاب کی قیادت کی بالکل صلاحیت نہیں تھی۔ البتہ صوبے دار بخت خاں میں یہ صلاحیتیں پوری طرح موجود تھیں۔ اسی وجہ سے بہادر شاہ نے تمام اختیارات بخت خاں کو دے رکھے تھے۔ لیکن مرزا مغل اُس کے کاموں میں مستقل دخل اندازی کرتے رہے۔ وہ سوچتے تھے کہ بادشاہ چندون کے مہمان ہیں اور ولی عہد ابھی کم سن ہے، اس لیے ہندوستان کا اگلا بادشاہ انھی کو ہونا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی دخل اندازیوں کی وجہ سے بخت خاں انقلاب کی قیادت کے لیے یکسو نہ ہوسکے اور انقلاب ناکام ہوکر رہ گیا۔ خواجہ صاحب نے اس پورے جھگڑے کے مفصل جائزے کے بعد لکھا ہے:

''انجام یہ ہوا کہ مرزا مغل نے بخت خاں کے راستے میں روکاوٹیں ڈالیں اور ان سے مخالفت شروع کی اور بخت خاں بچارے پر حریفوں کے مقابلے کا بوجھ ٹوٹ پڑا۔ ایک طرف انگریز تھے اور دوسری طرف مرزا مغل۔ اسی کش مکش میں فوجیں قابو سے باہر ہوگئیں۔ انتظام کی مشین بگڑ گئی، انگریزوں نے دہلی فتح کرلی اور انقلاب کی اسکیم دھواں ہوکر رہ گئی۔'' (بہادر شاہ کا مقدمہ، ص:۳)

انقلاب ۱۸۵۷ کے متعلق تقریباً تمام تاریخی کتابوں میں ایک سبز پوش عورت کا تذکرہ ملتا ہے۔ جو سبز لباس میں ملبوس ہوکر شہر میں گھومتی پھرتی تھی اور لوگوں کو انگریزوں کے خلاف جنگ پر ابھارتی تھی اور میدان جنگ میں خود بھی شریک ہوکر پوری جفاکشی کے ساتھ لڑتی تھی۔ اس سبز پوش خاتون کے متعلق مذکورہ چند باتوں کے سوا کوئی خاص معلومات نہیں ملتی۔ حتی کہ پاکستان سے شائع ہونے والے ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کی شخصیات پر مشتمل انسائیکلو پیڈیا میں بھی اس خاتون کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ لیکن حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے یہاں بھی اپنی اعلیٰ تحقیقی صلاحیت کا ثبوت دیا اور ''بیگمات کے آنسو'' میں صفحہ نمبر ۷۹ سے لے کر صفحہ نمبر ۸۴ تک پورے چھ صفحات پر مشتمل اپنی دل چسپ گفتگو کے ذریعے اس پُر اسرار خاتون کے حالات وکوائف کو بڑی حد تک ظاہر کردیا۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ انھوں نے ''محاصرۂ دہلی کے خطوط'' میں ساتویں نمبر پر وہ تاریخی خط بھی (باقی صفحہ ۲۷ پر)